Regd. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1985

اس پرچہ میں

اسلامی مملکت کا تصور

(علامہ اقبال رہ کے نزدیک)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ ــــــ لاہور

بدل اشتراک سالانہ پاکستان /۴۸ روپے غیرممالک /۹۸ روپے	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰ خط وکتابت ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۴ چار روپے
جلد ۳۸	نومبر ۱۹۸۵ء	شمارہ ۱۱

فہرست

۱۔ لمعات ــــــ ۲

۲۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (ثریا عندلیب صاحبہ) ــــــ ۱۲

۳۔ اسلامی مملکت کا تصوّر۔ (اقبالؒ کے نزدیک) (پرویزؒ) ــــــ ۱۷

۴۔ ضرورت، قرآنِ کریم کے صحیح مفہوم کی ہے! (ڈاکٹر سیّد عبدالودود صاحب) ۳۳

۵۔ باب المراسلات:۔ (۱) صدقہ اور زکوٰۃ۔ (۲) نابغۂ عصر۔ ــــــ ۴۸

۶۔ حقائق وعبر:۔ (۱) مولانا اصلاحی منکرینِ حدیث کی صف میں (۲) قومی اتحاد کی اندرونی کہانی۔ ۵۰

(۳) دارالعلوم دیوبند کے بانی۔ (۴) تبلیغی جماعت اور بدعات۔

(۵) نفاذِ اسلام کی بنیادی تدابیر۔ (۶) "ورد" سے روس اور بھارت کو شکست۔

(۷) جھوٹی قسمیں۔ (۸) مولانا کاندھلوی اور مارشل لاء۔

۷۔ افکارِ پرویزؒ کی صدی (محمد اسلام صاحب) ــــــ ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت: ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۵ ایبک روڈ لاہور

لمعات

مودودی صاحب نے قیام پاکستان کی جس طرح شدید مخالفت کی تھی، جماعت اسلامی کا اپنا شائع کردہ لٹریچر اس کی تفصیلات سے بھرا ہوا ہے۔ یہ تفصیلات آئندہ سطور میں قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ پاکستان کو قائم ہوئے پورے اڑتیس سال گزر چکے ہیں اور اس دوران پاکستانیوں کی نئی نسل جوان ہو چکی ہے۔ اس نسل کو چونکہ قیام پاکستان کے واقعات کا صحیح علم نہیں ہے۔ اس لئے جماعت اسلامی نے اس صورت حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے۔ کہ مولانا مودودی صاحب تو پاکستان کے بانیوں میں سے تھے۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے جماعت اسلامی کے نئے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اس پروپیگنڈہ مہم کا آغاز ۱۶ مئی ۱۹۷۶ء کو اس وقت کیا جب وہ جماعت اسلامی لاہور کے دفتر میں، فرخا بند کی تعمیر اور بنگلہ دیش پر بھارتی جارحیت کے خلاف منعقدہ ایک احتجاجی جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"تین شخصیتوں نے پاکستان بنایا، اولاً علامہ اقبالؒ نے، جنہوں نے الگ مملکت کا تصور دیا۔ دوم مولانا مودودی، جنہوں نے نظریہ دیا اور سوم حضرت قائداعظمؒ، جنہوں نے پہلے دونوں حضرات کی سوچ کو عملی شکل دی اور نظریہ اور تصور کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور بابت ۱۷ مئی ۱۹۷۶ء)

کچھ دنوں کے بعد یہ دعویٰ بھی کر دیا گیا، کہ مملکت پاکستان کا تصور بھی مودودی صاحب نے ہی دیا تھا۔ جماعت اسلامی کی جانب سے تازہ شائع کردہ کتاب، "تاریخ پاکستان کے بڑے لوگ" جس میں قیام پاکستان کی تاریخ کو بڑی طرح مسخ کیا گیا ہے، یہ دعویٰ ان الفاظ میں موجود ہے:۔

"اسی زمانے میں یعنی ۱۹۳۸ء میں مولانا مودودی نے تقسیم ہند کی ایک تجویز پیش کی، جو تقسیم ہند کی اُن تجویزوں میں شمار کی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان منظور کی۔"

(۱۹۸۲ء۔ ایڈیشن صفحہ ۳۵۵)

قیامِ پاکستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس مملکت خداداد کی پہلی اینٹ سید احمد خان صاحب نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو رکھی تھی، جب انہوں نے اسی دن مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی، جس نے بعد میں ترقی کرتے کرتے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ اسی لئے مورخین علی گڑھ تحریک اور قیامِ پاکستان کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ لیکن جب جماعتِ اسلامی نے مودودی صاحب کو پاکستان کے بانیوں میں سے ایک ثابت کرنے کے لئے سید احمد خان کا نام اس کے بانیوں سے حذف کر دیا، تو ان کے اس طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۶ء کے لمعات میں یہ پیشگوئی کی تھی کہ ابھی تو ان حضرات نے سید احمد خان کا نام حذف کرکے، مودودی صاحب کو قیامِ پاکستان کا کریڈٹ دیا ہے۔ لیکن کچھ دن اور گزرنے کے بعد یہ حضرات تحریکِ پاکستان کی تاریخ کو اس طرح مرتب کریں گے کہ اس کے بانیوں میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا نام بھی نہ ہوگا۔ اور قیامِ پاکستان اور اس کے تصور، نظریے اور حصول کا سہرا تنہا مودودی صاحب کے سر پر باندھ دیا جائے گا"۔

پرویز صاحب کی یہ پیشگوئی صحیح ثابت ہوئی۔ ابھی حال ہی میں جماعتِ اسلامی کی جانب سے تحریکِ پاکستان پر جو کتاب "تاریخِ پاکستان کے بڑے لوگ" شائع کی گئی ہے اور جس کا ذکر پچھلی سطور میں کیا جا چکا ہے، اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قیامِ پاکستان میں مودودی صاحب کا حصہ قائداعظمؒ سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ اس جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً جماعتِ اسلامی کے لیڈروں کی جانب سے ایسے بیان جاری کئے جاتے ہیں، جس میں قیامِ پاکستان کا سہرا مودودی صاحب کے سر باندھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم ابھی تک کچھ ایسے لوگ بھی باقی ہیں، جنہوں نے پاکستان کو اپنی آنکھوں کے سامنے قائم ہوتے دیکھا تھا۔ اس لئے وہ جماعتِ اسلامی کے اس قسم کے جھوٹے دعوؤں کی قلعی کھولتے رہتے ہیں۔

مثلاً پچھلے دنوں یعنی اگست اور ستمبر کے مہینوں میں یومِ پاکستان کی تقریبات منانے کے بہانے سے جماعتِ اسلامی نے پھر اس جھوٹ کو بار بار دہرایا کہ مودودی صاحب پاکستان کے بانیوں میں سے تھے۔ یہ پروپیگنڈہ ایسا وسیع تھا کہ قومی اسمبلی کے اراکین کو بھی اس کا نوٹس لینا پڑا۔ قومی اسمبلی کے ایک رکن جناب عثمان خان صاحب نے اس پروپیگنڈے کو سفید جھوٹ قرار دیا، چنانچہ مختلف اخبارات میں ان کا بیان ان الفاظ میں چھپا ہے:-

"اسلام آباد۔ ۱۰ ستمبر (نمائندہ خصوصی) نظامِ مصطفیٰ گروپ کے رہنما اور قومی اسمبلی کے رکن جناب محمد عثمان خان نوری نے کہا ہے کہ مولانا مودودی صاحب پاکستان اور بانئِ پاکستان

قائداعظمؒ محمد علی جناح کے مخالف لوگوں میں سے ایک تھے، انہیں پاکستان کے بانیوں میں شامل کرنا بہت بڑی تاریخی بددیانتی ہوگی۔ جماعتِ اسلامی پنجاب کے سربراہ کے حالیہ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی کو پاکستان کے بانیوں میں شمار کرنا، کہاں کا انصاف ہے۔ اس لئے کہ مولانا کے نظریات اور پاکستان کے خلاف ان کی جدوجہد کسی سے ڈھکی چھپی نہیں بلکہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

انہوں نے کہا کہ ابھی لاکھوں کی تعداد میں وہ لوگ بقیدِ حیات ہیں کہ جنہوں نے تحریکِ پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یہ لوگ جماعتِ اسلامی کے کردار کے عینی شاہد ہیں، انہوں نے کہا کہ جماعتِ اسلامی کے دامن پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کا جو داغ ہے، اسے چھپانا نہ صرف ایک زیادتی اور بددیانتی ہوگی بلکہ اس طرح جماعتِ اسلامی کا کردار مزید مشکوک ہو جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ دانشمندی اور دیانتداری اسی میں ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا جائے، انہوں نے کہا کہ جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں نے آج تک قائداعظمؒ کے مزار پر جاکر فاتحہ نہیں پڑھی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ابھی تک بانیٔ پاکستان سے بغض رکھتے ہیں۔

انہوں نے جماعتِ اسلامی کی حالیہ پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ مارشل لاء کی حمایت میں سب سے پہلے اسی جماعت کے امیر نے بیان دیا تھا اور پھر نو ماہ تک، ان کی جماعت کے لوگ، مارشل لاء کی چھتری تلے وزارت میں رہ کر، مارشل لاء کو تقویت پہنچاتے رہے اور اب مخالفت کرکے یہ لوگ جمہوریت کے چیمپئن بننے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ (روزنامہ مشرق لاہور بابت ۱۱ ستمبر ۱۹۸۵)

طلوعِ اسلام کے بہت سے قارئین نے بھی، جماعتِ اسلامی کی اس پروپیگنڈہ مہم کا سختی سے نوٹس لیا اور اس سلسلے میں ہمیں کئی خطوط موصول ہو چکے ہیں، جن میں سے ایک دو کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مزنگ لاہور سے ہمارے بزرگ قاری ۸۴ سالہ محترم محمد خان صاحب نے ہمیں لکھا:۔

"آج مورخہ ۱۳ ستمبر کے نوائے وقت کے صفحہ ۸ کالم ۲ پر جناب عثمان نوری صاحب کا ایک بیان شائع ہوا ہے، جس کی سرخی ہے مولانا مودودی کو بانیانِ پاکستان کی صف میں شامل کرنا بہت بڑی بددیانتی ہے، براہِ مہربانی، مودودی صاحب نے پاکستان اور قائداعظمؒ محمد علی جناح کی جو سخت مخالفت کی تھی، جماعتِ اسلامی کی کتابوں کے حوالے سے لکھیں اور ہوسکے تو تمام حوالجات مع تاریخ، اخبارات میں چھپوائیں۔ جماعتِ اسلامی کے جھوٹے پروپیگنڈے کا مناسب رد، صرف طلوعِ اسلام ہی کرسکتا ہے۔"

قارئین اس خط سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ نسل کہ جس کے سامنے پاکستان قائم ہوا تھا،

جماعت اسلامی کے جھوٹے پروپیگنڈے سے کس قدر پریشان ہے، اسی طرح دریا خان ضلع بھکر سے محترم منظور حسین صاحب کا خط اسی سلسلے میں موصول ہوا ہے۔ مراسلہ نگار نے جماعت اسلامی کی جانب سے حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "تاریخ پاکستان کے بڑے لوگ"، کا خصوصی سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جماعت اسلامی والے ٹھیک اُسی طریقے سے تحریک پاکستان کی تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں جس کی پیشگوئی پرویز صاحب نے جون ۱۹۷۶ء کے طلوع اسلام میں کی تھی۔ اس کتاب میں تاریخ پاکستان کے حوالے سے ۵۱ بڑے لوگوں کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن کا نام پہلی دفعہ سنا گیا ہے۔ لیکن پاکستان کی بنیاد رکھنے والے سید احمد خان اور ان کی علی گڑھ تحریک کا کوئی ذکر نہیں، اس کے برعکس، مودودی صاحب کے حالات زندگی اس پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے قیام میں سب سے زیادہ حصہ ان کا ہے۔"

یہ صورت حالات اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ جماعت اسلامی نے مودودی صاحب کو پاکستان کا بانی ثابت کرنے کا جو جھوٹا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے، اس کی تردید جماعت اسلامی کے اپنے لٹریچر سے کی جائے۔ اس سلسلے میں اگرچہ طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن تازہ صورت حالات کو سامنے رکھتے ہوئے، جماعت اسلامی کی نئی پروپیگنڈہ مہم کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ہم جماعت اسلامی کے اس عجیب دعوے کو لیتے ہیں کہ جس کے مطابق، قیام پاکستان کی تجویز اصل میں مودودی صاحب نے ہی پیش کی تھی، اس دعویٰ کو ان کی جانب سے حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "تاریخ پاکستان کے بڑے لوگ" میں ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:۔

" اس زمانے میں یعنی ۱۹۳۸ء میں مولانا مودودی نے تقسیم ہند کی ایک تجویز پیش کی، جو تقسیم ہند کی اُن تجویزوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان منظور کی" (صفحہ ۳۵۵، ۱۹۸۲ء۔ ایڈیشن)

تاریخی طور پر، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تقسیم ہند کی سکیم علامہ محمد اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے الہٰ آباد میں پیش کی تھی، یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس بارے میں دشمنوں تک نے شک نہیں کیا، لیکن جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان کی تاریخ کو اس طرح مرتب کرنا شروع کیا ہے، کہ اس بارے میں کسی کا ذہن علامہ اقبالؒ کی طرف جائے بھی نہیں اور وہ تصور پاکستان کو مودودی صاحب کے ذہن کی تخلیق سمجھیں۔ حیرت کی بات ہے! کہ اس کتاب کے چار ایڈیشن چھپ چکے ہیں، لیکن علامہ اقبالؒ کے کسی عقیدت مند

نے اس زیادتی پر ابھی تک جماعتِ اسلامی سے احتجاج نہیں کیا ہے۔
سید احمد خان نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے، مسلمانوں میں جو علمی بیداری پیدا کی تھی تو اس کے نتیجے میں انہیں اپنے سیاسی حقوق کا احساس ہوا۔ مودودی صاحب نے اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، مسلمان اور سیاسی کشمکش کے نام سے ایک سلسلۂ مضامین لکھنا شروع کیا، ان کے یہ مضامین دو حصوں میں کتابی صورت میں بھی شائع کئے گئے۔ مودودی صاحب نے ان مضامین میں متحدہ قومیت کو مسلمانانِ ہند کے لئے حد درجہ نقصان دہ قرار دیا۔ لیکن اس سے ان کا مقصد تحریکِ پاکستان کے لئے راہ ہموار کرنا نہیں تھا کیونکہ جب پاکستان کے قیام کا مطالبہ واضح صورت میں سب کے سامنے آگیا تو مودودی صاحب نے بڑے شدّومدّ سے اس کی مخالفت کی، بلکہ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان کا اور ان کی کوششوں کا مطالبۂ پاکستان سے کوئی تعلق نہیں، ان کے اپنے الفاظ ہیں:۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے، میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر تعداد میں ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے"۔

(مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوم صہ ۹۳ مطبوعہ آرمی پریس دہلی)

جب انکی اپنی جماعت کے بعض ارکین نے، برصغیر کی اس وقت کی سیاسی صورتِ حالات کے حوالے سے انہیں مطالبۂ پاکستان کا قائل کرنے کی کوشش کی تو مودودی صاحب نے فرمایا:۔
"مسلمان ہونے کی حیثیت سے، میری نگاہ میں، اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے، تمام روئے زمین ایک ملک ہے، انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے"۔　(ایضاً صہ ۹۴)

مطالبۂ پاکستان کو رَدّ کرتے ہوئے، مودودی صاحب اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں:۔
"آج جو لوگ اسلام کے تحفّظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں، کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس وہ اسلام کے ان امکانات سے واقف نہیں ہیں"۔　(ایضاً صفحہ ۵۸)

اسی کتاب میں مودودی صاحب نے پاکستان کا مطالبہ کرنے والی مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کے بارے میں فرمایا:۔
"مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے، جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے، ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، اُن کا گمان غلط ہے، دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا۔ وہ صرف

مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔ (ایضاً صـ ۱۳۱-۱۳۲)

مودودی صاحب کی پاکستان کے خلاف اس شدید مخالفت کو کم کرنے کے لئے بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ اس مرحلے پر پاکستان کی مخالفت نہ کریں۔ ایک دفعہ مسلمانوں کو برصغیر میں ایک قطعہ زمین حاصل کر لینے دو، بعد میں اس میں اسلامی نظام قائم کرنا آسان ہوگا، لیکن مودودی صاحب نے ان کی بات تسلیم کرنے کی بجائے فرمایا:۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے۔ جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالمِ دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ ایسی باتیں وہی لوگ کہہ سکتے ہیں، جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیتاً نابلد ہیں اور محض ادھر اُدھر سے چند باتیں اور نعرے سن سنا کر، سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے ہیں اور کوئی اور سمجھدار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خدا کے خوف سے آزاد ہوتے کی وجہ سے ان پڑھ اور حقائق وسیاست سے ناواقف، عوام کو بیوقوف بناتے ہیں، تاکہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں، ورنہ موٹی بات ہے کہ حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعاتِ زمین تاکتے پھریں۔ اس کے لئے آپ کو زمین کی نہیں بلکہ ایک ایسی مضبوط اور منظم جماعت کی ضرورت ہے، جو آپ کے پیشِ نظر، نظریۂ حکومت کو ماننے اور اس کے لئے مرمٹنے والی ہو، اگر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر لی، تو جہاں بھی وہ ہوگی، وہیں وہ اس نظریے کی حکومت قائم کرے گی"۔ (ایضاً صـ ۱۵۴)

مودودی صاحب کی پاکستان کی یہ مخالفت ابھی تک علمی سطح تک محدود تھی، لیکن جوں جوں پاکستان کی منزل قریب آتی گئی مودودی صاحب کی مخالفت میں بھی شدّت پیدا ہوتی گئی اور مطالبۂ پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے انہوں نے عملی اقدامات اٹھانے شروع کئے۔ برطانوی حکومت نے آزادی سے کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کے طول وعرض میں جو صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کرائے ان انتخابات کا مطالبۂ پاکستان سے گہرا تعلق تھا۔ ان اسمبلیوں میں اگر پاکستان کا مطالبہ کرنے والی مسلمانوں کی سیاسی جماعت، مسلم لیگ کے اراکین کی اکثریت منتخب ہو جاتی تو اس سے مطالبۂ پاکستان کو تقویت ملنی لازمی تھی۔ اس لئے جماعتِ اسلامی کے بعض اراکین کو ان کے ضمیر نے مجبور کیا کہ وہ پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالیں، لیکن ایسا کرنے سے پہلے، انہوں نے اپنے امیر جماعت یعنی مولانا مودودی سے اس بارے میں دریافت کرنا ضروری سمجھا، جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:۔

"جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹس موجودہ زمانہ کے جمہوری اصول پر مبنی ہیں، ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لئے ووٹ دینا بھی حرام ہے"۔ (رسائل ومسائل حصّہ اوّل صـ ۴۵ ستمبر ۵۱ ایڈیشن)

لیکن پیش آمدہ انتخابات کا تعلق صرف اسمبلیوں تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ ان کا گہرا اثر مطالبۂ پاکستان پر بھی پڑتا تھا۔ اس لئے ان اراکین نے اس معاملے کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر اپنے امیر سے رجوع کیا، جنہوں نے مندرجہ ذیل جواب کے ذریعے انہیں پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے سے منع کر دیا:۔

"ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو، اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں، جن پر ہم ایمان لائے ہیں"۔

(بحوالہ اخبار کوثر مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

لیکن مودودی صاحب کی اس شدید مخالفت کے باوجود، ان اسمبلیوں میں ایسے لوگوں کی اکثریت منتخب ہو کر آ گئی کہ پاکستان کا قیام، جن کے ایمان کا حصّہ تھا۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام یقینی نظر آنے لگا۔ جس سے پاکستان کے خلاف مودودی صاحب کے غیظ و غضب میں اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے پاکستان کے قیام کو روکنے کی ایک مؤثر تدبیر سوچی۔ یہ تدبیر اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو پاکستان کی مخالفت پر آمادہ کرنا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے قیام پاکستان سے صرف چند ماہ پہلے ان صوبوں کا دورہ کیا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، ان لوگوں کو آئندہ کے خطرات کی بھیانک تصویر دکھلا کر، مطالبۂ پاکستان کے خلاف بڑی آسانی سے اکسایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں جماعت اسلامی نے اپنا پہلا اجلاس ٹانک میں ۱۷۔ اور ۱۸۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو منعقد کیا۔ اس اجلاس میں مودودی صاحب نے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلم لیگ ایک غیر اسلامی تحریک ہے اور یہ کہ پاکستان کا قیام ان کے لئے، ہر صورت میں گھاٹے کا سودا ہے۔ ان صوبوں کے عوام نے مولانا مودودی صاحب سے یہ متعین سوال کیا کہ انہیں اس امر سے کوئی غرض نہیں کہ مسلم لیگ اسلامی جماعت ہے یا غیر اسلامی۔ لیکن جب پاکستان کا مطالبہ برّصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیٰحدہ مملکت حاصل کرنے کا ہے تو پھر کونسا امر مانع ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہ دیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا:۔

"جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے، یہ مسائل سرے سے پیدا ہی نہ ہوتے۔ اگر مسلمان فی الواقعہ اسلام کے سچے نمائندے ہوتے۔ اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقعہ، خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان"

پاکستان بن سکتا ہے"۔

روئیداد جماعت اسلامی حصہ پنجم شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی
ذیلدار پارک اچھرہ لاہور صفحہ ۶۵ (ایڈیشن کا سال نہیں دیا)

اس کے بعد ۲۵۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو انہوں نے مدراس میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کھل کر پاکستان کی مخالفت کی اور وہاں کے مسلمانوں کو اس کی تائید و حمایت سے روکنے کے لئے انہیں یہ یاد کرانے کی کوشش کی کہ :۔

ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کرلیں گے کہ جس قوم پرستی پر انہوں نے، اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابانِ مرگ میں لاکر چھوڑ گیا ہے۔ اور ان کی قومی جنگ' جسے وہ بڑے جوش وخروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے: جو ان کے لئے تباہی کے سوا، اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ (ایضاً صفحہ ۱۶۴)

تاہم مدراس کے محب الوطن مسلمانوں نے' مودودی صاحب کی بات سننے سے انکار کردیا بلکہ وہ مودودی صاحب کی پاکستان دشمنی پر مشتعل ہو گئے اور انہوں نے جماعت اسلامی کی جلسہ گاہ پر ہلّہ بول دیا۔ چنانچہ وہاں مودودی صاحب کو سخت ناکامی کی حالت میں اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا اجمال رہے کہ یہ زمانہ قیام پاکستان سے صرف تین چار ماہ پہلے کا تھا۔

ان دنوں مودودی صاحب چونکہ پاکستان کے خلاف ایک منظم مہم چلا رہے تھے اس لئے انہوں نے ساری جماعت اسلامی کو اس کام پر لگا دیا۔ کہیں تو وہ خود تقریریں کرتے، کہیں اپنے با اعتماد ساتھیوں کو اسی مقصد کے لئے بھیجتے۔ مثلاً جن دنوں مودودی صاحب نے خود مدراس میں پاکستان کے خلاف مذکورہ بالا تقریر کی ٹھیک انہی دنوں' ان کے اس وقت کے دستِ راس، جناب امین احسن اصلاحی پٹنہ میں بھارت کے صوبہ بہار کے مسلمانوں کو یہ قائل کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پاکستان کا مطالبہ فساد کی جڑ ہے۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں :۔

آپ کو معلوم ہے کہ جو نازک حالات اس وقت پیدا ہوگئے ہیں یہ سرسری اور سطحی نہیں' بلکہ ان کے اسباب نہایت گہرے ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ غنڈوں اور بدمعاشوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور دیر یا سویر یہ درست ہوجائیں گے' وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں، ہمارے نزدیک یہ سارے حالات ، اس قومیت کی تعلیم کا نتیجہ ہیں، جس کو پیدا کرنے کے لئے' اس ملک کے لیڈروں نے جدوجہد کی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو صرف موجودہ ہنگاموں اور فسادات پر ہی غور نہیں کرنا ہے۔ بلکہ آئندہ کے مفاسد پر بھی غور کرنا ہے اور ایک سوچی سمجھی ہوئی سکیم کے ماتحت آپ کو اس طرح کام کرنا ہے کہ فساد کی جو فصل، ہمارے لیڈروں کے ہاتھوں اس ملک میں بوئی گئی ہے وہ نشوونما نہ پانے پائے، اور اس کے پھیلنے اور پکنے سے پہلے لوگوں میں اس کے

پس بھرے ہونے کا یقین پیدا ہو جائے۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۲)

جناب ابن احسن کی تقریر سیاسی کی بجائے زیادہ تر علمی ہوتی تھی، جسے عام لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اسی اجلاس میں ان کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے ایک دوسرے لیڈر، ملک نصراللہ خاں عزیز نے فرمایا:۔

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقامت دین سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کرلینا ضروری ہے۔ جہاں دین کو برپا کرسکیں، حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالم دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ ایسی باتیں، وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیتاً نابلد ہیں اور محض ادھر ادھر سے چند باتیں اور نعرے سن کر سیاسی تحریکوں میں شامل ہوگئے ہیں اور کوئی سمجھدار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خوفِ خدا سے آزاد ہونے کی وجہ سے ان پڑھ اور حقائق و سیاست سے ناواقف عوام کو بیوقوف بناتے ہیں، تاکہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں۔ (ایضاً ۱۵۴)

دراصل یہ مودودی صاحب کے پاکستان کی مخالفت کے بارے میں مشہور الفاظ ہیں، جو ملک نصراللہ خان عزیز اور ان کی طرح کے جماعت اسلامی کے تمام لیڈر وقتاً فوقتاً دھراتے رہتے تھے۔ اور یہ الفاظ قائداعظم اور مسلم لیگ کے بارے میں کہے جاتے تھے، جو ان دنوں حصولِ پاکستان کی کوششوں میں مصروف تھے۔ مودودی صاحب مسلم لیگ کو ایک غیر اسلامی جماعت سمجھتے تھے۔ اپنی کتاب "مسلمان اور سیاسی کشمکش" (حصہ سوم) میں وہ اس کے بارے میں یہ فتویٰ پہلے ہی دے چکے تھے:۔

"نہ ان کی جماعت، اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے نہ انکی امارت، اسلامی اصطلاح کی رُو سے امارت ہے۔ نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکہ کھا کر، جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی، ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔ (صفحہ ۸۲)

لیکن مودودی صاحب کی پاکستان کے خلاف اس مہم کا خاتمہ ناکامی کی صورت میں ہوا۔ اور انکی خواہشات کے علی الرغم پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ اخلاق کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنے بیان کئے اسلامی اصولوں کے مطابق ہندوستان میں رہ کر اسلام کی خدمت کرتے، لیکن اس کی بجائے آپ پہلی فرصت میں، ہندوستان سے سیدھے پاکستان تشریف لے آئے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان میں پناہ حاصل کر لینے کے باوجود، مودودی صاحب کی پاکستان دشمنی میں کوئی کمی نہ آئی۔ اور انہیں اپنی اس دشمنی کو دکھانے کا ایک فوری موقع میسر آگیا۔

جس اصول پر ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی تھی، اس کے مطابق صوبہ سرحد کو پاکستان کا ایک

حصّہ بننا تھا، کیونکہ وہاں پر مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن قیام پاکستان کے وقت وہاں پر ہندو کانگریس کی وزارت تھی۔ ہندو کانگریس کو یہ یقین تھا کہ اگر مسلمانوں کی اس اکثریت والے صوبے میں ریفرنڈم کرایا جائے، تو یہاں کے لوگ پاکستان کی بجائے ہندوستان سے الحاق کر لیں گے۔ اس لئے جب ۳ جون ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کی سکیم کا اعلان ہوا، تو ہندؤں نے صوبہ سرحد کے بارے میں، انگریز حکومت سے یہ شرط منوالی کہ وہاں پر ریفرنڈم کروایا جائے خیال فرمایئے کہ اگر اس ریفرنڈم کے نتیجے میں، صوبہ سرحد کا الحاق، ہندوستان سے ہو جاتا، تو پھر پاکستان کتنے دنوں زندہ سلامت رہ سکتا تھا۔ اس وقت ایک ایک ووٹ پوری مملکت پر بھاری تھا اور ہر پاکستانی کا فرض تھا کہ وہ پاکستان کے حق میں ووٹ ڈلوائے۔ لیکن اس کے باوجود، مودودی صاحب کی پاکستان دشمنی میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لئے، جماعتِ اسلامی کے اراکین نے مودودی صاحب سے اجازت چاہی۔ تو آپ نے انہیں ووٹ دینے کی اجازت تو دی لیکن انہیں یہ نہ کہا کہ وہ پاکستان کے حق میں ووٹ دیں، بلکہ ان کے جواب سے یہ متبادر ہوتا تھا کہ یہ ووٹ پاکستان کے خلاف دیا جائے۔ ان کا یہ جواب قارئین بھی خود ملاحظہ فرمالیں:۔

"رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں، تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ جماعت اپنے ارکان کو، صرف ان امور کی پابند کرتی ہے، جو تحریکِ اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہوں اور یہ معاملہ نہ اصولی ہے اور نہ مقصدی"

(رسائل و مسائل مصنف مودودی صاحب حصّہ اوّل صـ۳۴۳ ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن)

یعنی جو معاملہ پاکستان کے لئے رگِ جان کی حیثیت رکھتا تھا وہ مودودی صاحب کے نزدیک نہ تو اصولی تھا اور نہ مقصدی یہ ہے جماعتِ اسلامی کی جانب سے حالیہ پروپیگنڈہ مہم کی حقیقت کہ مودودی صاحب نے نہ صرف یہ کہ مملکتِ پاکستان کا تصوّر دیا تھا، بلکہ وہ اس کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ اگر ایک منٹ کے لئے جماعت کی اس غلط بیانی کو تسلیم کر لیا جائے کہ واقعی مملکتِ پاکستان کا تصور مودودی صاحب نے دیا تھا تو پھر جب یہ عملی شکل اختیار کرنے لگا تو اس کی انہوں نے اتنی شدید مخالفت کیوں کی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے!

یہ تو تھی مودودی صاحب کی قیامِ پاکستان کی مخالفت کی کچھ تفصیلات قیامِ پاکستان کے بعد، انہوں نے اس مملکت کو کمزور کرنے کے لئے جو کچھ کیا وہ بھی ایک طویل داستان ہے، پرویز صاحب اس داستان کو ایک پمفلٹ "گہری سازش" میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس لئے اگر قارئین اس بارے میں مزید تفصیلات چاہتے ہوں تو وہ ادارہ کی جانب سے شائع کردہ اس پمفلٹ کا مطالعہ کریں۔

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ !

اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات نہایت ناپسندیدہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس پر عمل نہ کیا جائے۔ اب ہم سب قرآن پڑھنے والے اللہ کی اس ناپسندیدگی کو جانتے تو بہت اچھی طرح ہیں۔ مگر اس علم کے باوجود ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے اپنے معاملاتِ زندگی اور معمولاتِ روز و شب میں اللہ کی اس ناپسندیدگی کو ہی خاص طور پر اس طرح اپنا رکھا ہے گویا اس کے بغیر ہم ہیں ایک قدم چلنے کی سکت نہ ہو۔ اللہ تو ہم سے یہ پوچھتا ہے کہ تم ایسی بات کہتے کیوں ہو جسے تم کرتے نہیں، کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے اس طرف سے تو اپنے کان بند کر رکھے ہیں۔ برعکس اس کے ہم نے یہ خود ساختہ نکتۂ نظر اپنا رکھا ہے کہ ہمیں دوسروں کے سامنے کہنے کی حد تک ضرور اچھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں۔ اور بہ حیثیت نام نہاد مسلمان قرآن و سنت کے حوالے دیتے ہوئے بڑھ چڑھ کر اخلاق و کردار کا پرچار کرتے رہنا چاہیئے تاکہ کسی کو ہمارے مسلمان ہونے میں شُبہ نہ ہو۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ سوسائٹی میں ہم معتبر نظر آئیں۔ باقی جہاں تک کچھ کرنے اور اچھی بات کو عمل میں لانے کا تعلق ہے تو اسے ہم اپنا ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں جس میں کسی دوسرے کا دخل ہم برداشت کرتے ہیں نہ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ہمارا مُوقف یہ ہوتا ہے کہ ہمارا جو دل چاہے گا وہی کریں گے یعنی جو کہیں گے وہ نہیں کریں گے۔ پر آپ کو کس نے حق دیا ہے ہم پر اعتراض کرنے کا۔ بات بھی بالکل سچ ہے۔ جب ہم دھڑلے سے اللہ کے حکموں کی نافرمانی کرتے رہتے ہیں تو اللہ کے بندوں کی ہمیں کیا پروا ہو سکتی ہے۔ اوروں سے ہم کسی نہ کسی بات کا وعدہ تو ضرور کریں گے، وعدہ کرنے میں ایک ذرا سی زبان ہی تو ہلانا پڑتی ہے اور کچھ تو اپنے پلّے سے نہیں جاتا۔ دوسرے پر اپنی "خود ساختہ خوش اخلاقی" کا سحر طاری رہنا چاہیئے تاکہ وہ ہمارے دامِ تزویر کا اسیر ہو سکے۔ چنانچہ جب کسی کو ہم سے کسی مدد کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو ہم نہایت خندہ روئی کے ساتھ اُسے اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ "آپ اس بارے میں فکر ہی نہ کریں بس اپنا کام ہوا سمجھیئے" اُدھر وہ مطمئن ہو کر واپس لوٹا، اِدھر ہم نے ایک قہقہہ لگایا اور اس بات کو جھٹک کر ذہن سے الگ کر دیا کہ فلاں کے ساتھ ہم نے یہ وعدہ کیا تھا۔ چونکہ ہماری اکثریت کا یہی وطیرہ روز و شب ہے اس لئے کوئی ایک دوسرے سے شکوہ و شکایت کرنے کا بھی مجاز نہیں۔ یوں ہماری یہ معاشرتی منافقت بلا روک ٹوک آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ جب شعارِ زندگی یہ ہو جائے کہ جھوٹ کی برائی تو کرو اور اس سے بچنے کی تلقین بھی جاری رکھو لیکن خود اسطرح جھوٹ کے پابند رہ کر جھوٹ بولو اور بولتے رہو

کہ سننے والے کو اس کے سچ ماننے میں ذرہ بھر تامل نہ ہو سکے وہ اس کو سچ ماننے پر مجبور ہو جائے تو ایسے معاشرے میں وہ افراد کہاں سے پیدا ہوں گے جو اس ارشاد ربانی لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ کو اپنے اعمال کا آئینہ بنا کر کہنے اور کرنے کا فرق چھوڑ سکیں۔ ہمارے ہاں بدترین و سنگین جرم رشوت کے فروغ کا جو عالم ہے اسے کون نہیں جانتا۔ دراں حالے کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس کے خلاف کہتا اور اس کی برائی کرتا نظر آتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ رشوت کے کاروبار کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ وجہ تو وہی ایک ہے جو قرآن نے بیان کر دی ہے۔ مگر کوئی دھیان دے تو! رشوت دینے والے کہتے ہیں ٹھیک ہے جی! رشوت بہت بری چیز ہے لیکن ہم کیا کریں۔ اس معاشرے میں کوئی بھی کام تو رشوت دیئے بغیر انجام نہیں پاتا۔ ہم اپنی زندگی کی گاڑی کو کیسے آگے بڑھائیں۔ ہم تو اپنی روزی کو قائم رکھنے کی خاطر اپنے بال بچوں کی روٹی اور ان کے مستقبل کی خاطر یہ برائی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ادھر رشوت لینے والوں کو تو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ دن رات ان کی جیبیں بھرتی رہیں انہیں جائز و ناجائز۔ حرام و حلال سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ یہی ذہنیت معاشرے میں ہر قسم کی گراوٹ اور ناہمواری کو نہ صرف جنم دیتی ہے بلکہ اسے چاروں طرف پھیلانے میں ہر طرح ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اور بالآخر جو نتیجہ سامنے آتا ہے اسے شب و روز ہماری کھلی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ جو کہو وہ کرو نہیں، یہ ہے وہ بنیاد جس پر ہوا و ہوس کے بندے مفاد پرستیوں کے فریب نظر قصر ایستادہ کرتے ہیں۔ اور انسان اپنے مقام سے گر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے ایمان اور عمل کو لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے۔ یعنی حق کو دل کی رضا مندی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے عمل میں لایا جائے۔ اسے ہم سب مانتے ہیں اور یہ بھی ہم نے قرآن پاک میں پڑھ رکھا ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ ایمان اور عمل صالحہ کا نتیجہ اجرِ عظیم کی صورت میں ملے گا تو پھر ہمارے لئے یہ پستیاں اور ذلتیں کیوں! اس لئے کہ ہم نے اپنے کہنے اور کرنے کو جدا جدا کر رکھا ہے۔ ہمارا ایمان اور عمل ایک دوسرے سے وابستہ نہیں، حق کی روشنی کہاں سے پھوٹے اور ہمیں رفعت و شوکت کیونکر حاصل ہو! ہمارا عظیم المیہ یہی ہے کہ ہمارے قرآن کے بتائے ہوئے کرنے کے کام محض پڑھنے کے اندر تبدیل ہو گئے۔ جب آپ کسی چیز کے محض پڑھنے پر مطمئن ہو جائیں اور اس سے سمجھ لیں کہ ثواب سے ہم نے جھولی بھر لی۔ تو پھر کرنے کا کام بند ہو جاتا ہے یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب تک انسان کا دل رضا مند نہ ہو کوئی بات مانی جاتی ہے نہ اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ لیکن جب زبان کے اقرار سے ظاہر یہ کیا جائے کہ ہمیں منظور ہے ہم تمہارے ساتھ ہیں اور دل اس کی گواہی نہ دے رہا ہو تو معاشرے کو انتشار اور فتنہ و فساد کے سوا کیا حاصل ہو گا۔ ہمارے دور میں جس قدر بھی جرائم ہو رہے ہیں ان کی بنیادی وجہ دل اور زبان میں ہم آہنگی کا نہ ہونا ہے۔ اس کے بعد اعتماد ہی اٹھ جاتا ہے۔

؎ نہ دیر میں نہ حرم میں - جہاں جو کچھ نظر آئے وہ فی الحقیقت وہ نہ ہو تو اعتبار کیونکر آئے !
یہی تو منافقت ہے جو اس طرح ہمارے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے - گویا اس کے بغیر ہم سانس ہی نہیں لے سکتے - قرآن نے منافقین کی توضیح چار لفظوں میں کر دی ہے - يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ - وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں کیا خدا کا یہ فرمان ہمیں آئینہ نہیں دکھا رہا - حقائق سے نگاہیں چرانے سے حقائق مٹ نہیں جایا کرتے -
ہم مانیں یا نہ مانیں یہ حقیقت تاریک رات کی طرح ، ہمارے سامنے ہے کہ ہماری زندگی کا ہر گوشہ اور ہماری معاشرت کا ہر پہلو اسی منافقت سے ملوث ہے جس کے اختیار کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم بنایا گیا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ؕ یقیناً منافقین جہنم کے سب سے نچلے درجے کے مستحق ہیں - ہماری منافقانہ ذہنیت ہم سے نیکی اور بھلائی کے کام محض نمود و نمائش کی خاطر کرواتی ہے یا محض اپنے پندارِ نفس کی تسکین کے لئے اس منافقت سے ہماری شخصیت دوہری اور دوغلی ہو جاتی ہے - ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور - یوں کسی موقع پر بھی وہ نظر نہیں آتے جو دراصل ہم ہوتے ہیں - دل کے انکار کے ساتھ دوسروں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بزعمِ خویش ہم ان کو دھوکہ دیتے ہیں جبکہ ہمارے دلوں کا یہ روگ خود ہماری ذات کو مسلسل دھوکے میں رکھتا ہے - ہم قرآن کو پڑھنے اور سننے والے یکسر یہ بھول جاتے ہیں کہ خدائے علیم و خبیر ہمارے دلوں میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانتوں تک کو جانتا ہے - يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ -
لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ - کی عظیم آیت سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ اس میں دو نظاموں ، دو نظریوں کا فرق بتایا گیا ہے - جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کائنات کی ہر شے اپنے فریضہ کی ادائیگی کے لئے سرگرمِ عمل ہے - ان اشیائے کائنات کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ وہ کام کرتی ہیں باتیں نہیں کرتیں - اقبالؒ کہتے ہیں ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

تمام اشیائے کائنات خاموشی سے اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری کر رہی ہیں اس سے یہ اصول ہمارے سامنے آیا کہ کام کرنے والے باتیں نہیں کیا کرتے - مگر انسان کی یہ کیفیت ہے کہ باتیں تو بڑھ چڑھ کے کرے گا اور عمل کے نام سے صفر - قرآن ہم سے سوال کرتا ہے کہ جو کہتے ہو وہ کرتے کیوں نہیں - تمہارے سامنے اتنی بڑی کائنات ہے جو دن رات خاموشی سے مصروفِ عمل ہے مگر تم صرف باتیں ہی کرتے چلے جاتے ہو - یہی تو ہمارا رویہ ہے نشستند و گفتند و برخاستند - خدا تعالیٰ نے ہمیں بولنے کی صلاحیت عطا کر کے کائنات سے ہمیں متمیز کیا ہے تو کیا اس صلاحیت کا صحیح استعمال ہماری ذمہ داری نہیں ؟ قرآن کریم میں خارجی کائنات کے نظامِ عمل کا جو

تقابل دکھایا گیا ہے تو اس لئے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ وہ ہیں جو محض باتیں نہیں کرتے وقت آن پڑتا ہے تو ہتھیلی پہ جان رکھ کر نیا رسو جاتے ہیں۔ خدائے کبیر کی اس واضح رہنمائی کے ہوتے ہوئے ہم لوگوں نے کیا روش اپنا رکھی ہے! کاش ہم نے لحظہ بھر رک کر سوچا ہوتا۔ ہماری یہ حالت ہوگئی ہے کہ ہمارے کرنے کے کام بھی بس کہنے کی صورت میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ عمل سے بیگانہ ہوکر باتوں کو ہم نے زادِ راہ بنا لیا ہے اور اب تو ماشاءاللہ ہمارے ذرائع ابلاغ ہمارا بڑا سہارا ہیں۔ ان سے ہماری باتیں۔ مذاکرات۔ سیمینار۔ کانفرنسیں بیانات ساری دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ پھر بابل کے مینار میں کوئی دوسری بات سنائی ہی نہیں دیتی۔ وہ کام بھی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ رپورٹیں چھپ گئیں۔ اس کے بعد جو کوئی پوچھتا ہے:

میرے دکھ کی دوا کہاں ہے تو دوا کیا نسخہ ہی نہیں ملتا!

یہ ہے لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ کی وہ تفسیر جو ہماری شامتِ اعمال نے لکھی ہے۔ قرآن کا یہ اعلان ہمیں منافقت سے بچنے اور رد کرنے کے لئے ہے۔ مگر ہم نے تو قرآن کے الفاظ قرآن کی آیات کو پڑھ کر، سن کر، ثواب، حاصل کرنا ہے۔ منافقت کو ہم کیسے چھوڑ سکتے ہیں وہ تو ہمارا لازمۂ زندگی ٹھہری اس کے بغیر ہمارے معاشرتی معاملات "سدھر" نہیں سکتے۔ ہم کسی شعبۂ زندگی میں "کامیاب" نہیں ہو سکتے اور ذرا منافقت کی منافقت دیکھئے کہ اسے ڈپلومیسی کا نام دے دیا گیا ہے۔ تاکہ ہم منافق کہلانے سے بچیں رہیں۔ اب ہمارا موقف یہ ہے کہ ڈپلومیسی اختیار کئے بغیر ہم دوسرے ملکوں سے اچھے تعلقات نہیں رکھ سکتے۔ نفع بخش کاروبار نہیں کر سکتے "آج کی کامیابی کا راز" ڈپلومیسی اور صرف ڈپلومیسی ہے جو اس سے روگردانی کرتا ہے دھکے کھاتا ہے۔ روندا جاتا ہے۔ اس سب کے باوجود مجھے یہ حق بات کہنے دیجئے کہ قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب کوئی معاشرہ کسی برائی کو برائی سمجھنا چھوڑ دیتا ہے۔ پھر اس کی اصلاح کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ۔

(ثریا عندلیب)

قارئین طلوعِ اسلام کے لئے مژدہ

مفکرِ قرآن علامہ پرویزؒ کے معرکتہ الآرا سلسلۂ معارف القرآن کا پہلا حصہ، "من و یزدان" کا تازہ ایڈیشن جو کچھ عرصہ سے نایاب تھا طباعت کے لئے پریس کو بھیج دیا گیا ہے۔ قیمت اور دیگر کوائف کے لئے اعلان کا انتظار فرمائیں۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحب قرآن۔ خود قرآن کے آئینے میں
حسنِ سیرت کی رعنائیاں۔ خالقِ حسن کی نگاہ میں

- سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اسکی تشریح احادیث صحیحہ کی روشنی میں
- ہر واقعہ کی تائید علم وبصیرت اور دلیل وبرہان کی رُو سے
- غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلّل اور مسکت جواب
- دنیا بھر کے اربابِ فکر ونظر کا خراجِ تحسین

بارگاہِ رسالت مآبؐ میں

ایک انقلاب انگیز تصنیف، ایک عہد آفریں کوشش۔ عشق وخرد کا حسین امتزاج

بڑا سائز۔ ضخامت پانچسو صفحات۔ کاغذ نہایت اعلیٰ، جلد مضبوط، مزیّن اور مطلّا

قیمت فی جلد -/۹۰ روپے علاوہ محصول ڈاک

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

مکتبہ دین ودانش۔ چوک اُردو بازار لاہور

اسلامی مملکت کا تصوّر

(اقبالؒ کے نزدیک)

پرویز

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را بیفشاں بر ددگیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

دین کی تاریخ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم، بصیرت افروز حقیقت بیان کی ہے جب کہا کہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۙ (22/52)

اے رسولؐ! تجھ سے پیشتر کوئی صاحبِ وحی ایسا نہیں ہوا جس کے سامنے یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ (اس کی وفات کے بعد) دین کے مخالفین نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کردی ہو۔ اس کے بعد خدا ایک اور نبی بھیج دیتا اور اس کی طرف وحی کے ذریعے اس آمیزش کو زائل کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا صاحبِ حکمت ہے۔

رسولؐ کی وحی میں آمیزش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خدا کا دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین نام تھا احکام و اقدارِ خداوندی کو معاشرہ میں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا۔ اس کے برعکس، مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق تھا جو بندگی، پرستش، یا مختلف رسوم کی رُو سے انفرادی طور پر قائم ہو جاتا تھا۔ دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابتداء میں دین ہی تھے۔ (قرآنِ کریم میں ہے کہ خدا نے ہر قوم میں رسولؐ بھیجے تھے)۔ مفاد پرست گروہوں نے جن کے سرکردہ مذہبی پیشوا تھے، انہیں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ

يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ ...... (2/79)

یہ خود شریعت وضع کرتے اور لوگوں سے کہتے کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے۔ اور ایسا کچھ پیسے کمانے

کے لئے کرتے۔ مذہب ان کا پیشہ بن جاتا تھا۔
خدا نے رسول اللہ کی طرف جو دین بھیجا اس کے متعلق کہہ دیا کہ
وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ...... (٦/١١٦)
خدا نے اس وحی کی رُو سے اپنے قوانین کو عدل و صداقت کی بنیادوں پر مکمل کر دیا ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔
اس لئے کہ
اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (١٥/٩)
ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔
ظاہر ہے کہ اس کے بعد وحی کی ضرورت نہ تھی، اس لئے یہ ختمِ نبوّت کا اعلان تھا۔ کلام اللہ کے مکمل، غیر متبدّل اور محفوظ ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب خدا کے بندوں کے ساتھ کلام کرنے کا ذریعہ اس کا یہی کلام (قرآن مجید) ہوگا۔
لیکن جو کچھ دین کے ساتھ اس سے پہلے ہوتا رہا وہی کچھ اس دین کے ساتھ بھی ہوا جو قرآن میں دیا گیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قرآن محفوظ نہ رہا؟ کیا اس میں بھی آمیزش ہو گئی؟ اگر ایسا ہو گیا تو خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس نے اسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے اوپر لی تھی؟......
نہیں! ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کا متن تو بالکل محفوظ رہا۔ اس میں نہ ذرا سا تغیّر و تبدّل ہوا، نہ کسی قسم کی آمیزش! لیکن ہوا یہ کہ خارج از قرآن متعدد عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح دینؔ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے وہ دینؔ نہیں بلکہ وہی مذہب ہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کی سب سے پہلی محسوس علامت یہ ہوتی ہے کہ اُمّت میں وحدت نہیں رہتی۔ وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے، اور ہر فرقہ کی شریعت کی آخری سند (خدا کے بجائے) کوئی نہ کوئی شخصیت قرار پا جاتی ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (٣٠/٣١)

اسلام مذہب بن گیا

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) جب دینؔ، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو خدا ایک اور نبی بھیج دیتا تھا جو وحی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا تھا۔ لیکن ختمِ نبوّت کے بعد، نبوّت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسے جاری رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ رسول اللہ ؐ کے بعد خدا کی وحی (قرآن مجید) میں آمیزش نہیں ہو سکتی تھی جسے الگ کرنے کے لئے نبیؔ کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ خدا کی آیات (قرآنی قوانین) اپنی منزہ شکل میں موجود تھیں۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ ان آیات کو (قرآن الفاظ میں) "محکم" کیا جائے۔ (ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ) آیاتِ قرآنی کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں دینؔ کی اساس قرار دیا جائے۔ انہیں حق و باطل، جائز و ناجائز، صحیح اور غلط کا معیار تسلیم کیا جائے لیکن یہ

فریضہ انفرادی طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ اُمّت کا اجتماعی فریضہ تھا جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کا جملہ کاروبار، قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ کتبِ سماوی کے نزول کا مقصد یہی تھا۔

استحکامِ آیات اللہ کا عملی طریق

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ..... (2/213) کہ لوگوں کے اختلافی امور میں ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ رسول اللہ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ ــــ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ ... (5/48) "تم لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو"۔ اس اُمّت سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10)

اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی رو سے کر لیا کرو۔

حتّیٰ کہ حتمی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5/44)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، آیات اللہ کو محکم کرنے کے لئے خدا کی طرف سے کسی کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) اس فریضہ کو اُمّت نے خود سرانجام دینا تھا۔ یعنی خارج از قرآن عناصر کو شریعتِ خداوندی قرار دینے کے بجائے کتاب اللہ کو مملکت کا ضابطۂ نظام قرار دینا، اُمّت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا کی طرف سے جس نے آنا تھا وہ آخری مرتبہ آ کر اور خدا کی مکمل و محفوظ کتاب دے کر چلا گیا تھا۔ (علیہ التحیۃ والسلام)

ــــــــــــ (٥) ــــــــــــ

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، "اسلام، صدیوں سے دین کے بجائے مذہب بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اُمّت کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو، وہ دینِ خداوندی نہیں۔ اسلام اسی صورت میں الدّین کی شکل اختیار کر سکے گا جب اپنی ایک آزاد مملکت ہو اور اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ ہمارا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جس نے اس فراموش کردہ حقیقت کو اُمّت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تھے حکیم الاُمّت، علامہ اقبالؒ۔ انہوں نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مامور من اللہ ہیں، یا انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ایسا دعوےٰ ختمِ نبوّت کے منافی اور یکسر باطل تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ قرآنِ کریم پر غور و تدبّر اور اسوۂ رسول اللہ کے گہرے مطالعہ سے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کلام کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے، اس میں روش روش پر آپ کو عظمتِ قرآنی کے پھول کھلے دکھائی دیں گے۔ ان کا پیام، قرآنی حقائق ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب سابقہ انبیاءِ کرامؑ دین کو اس حقیقی شکل میں پیش کرتے تھے تو مذہبی پیشوائیت

کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصور پیش کیا اور قائد اعظمؒ نے اس تصور کی عملی تشکیل کے لئے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا۔ نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی کیونکہ ان کے پیشِ نظر تو اسلام کا وہی تصور تھا جس میں اعتقادات، عبادات اور شخصی قوانین کی آزادی ہو اور پبلک لاز، مغرب کے جمہوری انداز سے وضع کئے جائیں۔ ان کا اسلام کے متعلق یہی تصور تھا جس پر جامع انداز میں تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام تو اسی صورت میں آزاد ہو سکتا ہے کہ جملہ قوانینِ مملکت، کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین کئے جائیں۔ اور یہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی نظام کا یہ تصور، اُمت کی نگاہوں سے صدیوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

قرآن کا نصب العین۔ اس کی منزل۔ اس کا منتہیٰ۔ اس کا مقصود کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا اسلام کا تصور، ان کے رسوم و مناسک، ان کا شعارِ زندگی، ان کا آئینِ حیات کچھ اور۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ؎

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد در ایاغ او نہ مے دیدم، نہ دُرد

اصل یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ نے قرآنِ کریم کے نخلِ حیات کا پھل کھایا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس کے ساغرِ زندگی میں، قرآن کی شرابِ طہور تو ایک طرف، اس کا تہ جرعہ تک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ حقیقت انتہائی تعجب انگیز اور حیرت افزا نہیں کہ ؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

وہ قوم جس نے قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کو نیست و نابود کر دیا، اس کے بعد، وہ خود تختِ ملوکیت بچھا کر اس پر مسند نشین ہو گئی اور پھر ؎

تانہالِ سلطنت قوت گرفت دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

جب نظامِ ملوکیت محکم ہو گیا تو دین، تمام تر اسی کے رنگ میں رنگا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ —— آفریدی شرع و آئینے دگر —— اسلام کی جگہ ایک مذہب، ایک نئی شریعت وجود میں آ گئے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ —— اندکے با نورِ قرآں درنگر۔ اپنے آئینِ حیات کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لو۔

یہی تھا وہ "نورِ قرآن" جس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی تصورات نہایت واضح الفاظ میں پیش کئے۔ آج کی نشست میں، میں اس کے مختصر سے خط و خال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس ضمن میں، ان کے سات لیکچروں کے مجموعہ میں سے چھٹا خطبہ، اور ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کا خطبۂ صدارت، خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ میری یہ تصریحات بیشتر انہی اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ یہ خطابات انگریزی زبان میں ہیں۔ یہاں ان کا رواں ترجمہ پیش کیا جائے گا

کیونکہ لفظی ترجمہ سے مفہوم سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

(۰)

آپ نے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

الہ آباد کا خطبۂ صدارت

آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ و پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کرکے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذنِ بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے۔ نہیں۔ یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفسِ اسلام پر، بحیثیت ایک نظامِ حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں۔

اس تمہید کے بعد انہوں نے، مذہب اور دین کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا:۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کلیسائی نظام نہیں جس کا مقصود خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کرلے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کردیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فِٹ ہو۔ وہ ایک فعّال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اِس نظری بحث کے بعد وہ اُس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:۔

ہندوستان، دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا)۔ اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

تنہا ایک ملک میں سات کروڑ[1] فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلام پر کیا اثر ہوگا۔

اُن کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اُس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ

پاکستان کا ہیولیٰ

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے .... مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ

اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر ثبت ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے یہ نہ صرف اپنی حقیقی روح سے قریب تر ہو جائیں گے بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی ہم دوش ہو جائیں گے۔

---

[1] اُس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

> اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے مملکتِ پاکستان کا جو نظریہ اور تصور پیش کیا تھا اس کی غرض و غایت اور منتہیٰ و مقصود کیا تھا؟ انہوں نے یہ تصور سنہ ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔ (اگرچہ خطبات تشکیل جدید اس سے بھی دو سال پہلے دیئے گئے تھے) حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا سارا کلام اور پیام انہی تصورات کی توضیح و تشریح ہے۔

———— (٠) ————

واحد ضابطۂ قوانین

اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک، واحد اور غیر منقسم اُمت ہوتی ہے جو دین کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں نہ مذہبی فرقے ہوتے ہیں، نہ سیاسی پارٹیاں نہ اس کی "پارلیمان" میں حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف کی تقسیم تفریق ہوتی ہے۔ اس مملکت، یا اُمت کا ایک ضابطۂ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز و تفریق ہوتی ہے، اور نہ ہی کوئی گروہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ فقہ کی پیروی کرے گا۔ ایک مملکت کے اندر الگ الگ ضوابطِ قانون کی پیروی تو مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہوتی ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن جس مملکت کی تشکیل کا نظریہ علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، ظاہر ہے (اور انہیں اس کا علم تھا) کہ اس میں مسلمانوں کے متعدد فرقے ہوں گے۔ سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کس طرح ہو سکے گا جس کا اتباع تمام مسلمان یکساں طور پر کریں؟ سیکولر حکومت میں تو یہ مسئلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذاہب یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے پیروؤں کو، اپنے اپنے پرسنل لاز کی آزادی ہوتی ہے اور مملکت کے پبلک لاز کے وضع کرنے میں مذہب کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت تو سیکولر نہیں ہوتی۔ اس میں اس قسم کی تفریق کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ بنظرِ غائر دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء کے سرخیل (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ کے درمیان مشہور معرکۂ دین و وطن "مملکت" کے اسی (دو) جداگانہ تصورات کا پیدا کردہ تھا۔

نیشنلسٹ علماء سیکولر حکومت کے مؤید تھے اور علّامہ اقبالؒ اسے اسلام کے یکسر خلاف قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک، مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہی یہ تھی کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کو خلافِ اسلام سمجھتے تھے۔ ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہوگی کہ علّامہ اقبالؒ نے جب اسلامی مملکت کا تصوّر پیش کیا تو ان کے سامنے بنیادی اور اہم ترین سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب ہوگا جس میں پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق نہیں ہوگی اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں اس نہایت اہم اور نازک ترین مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے جس کے ضروری اقتباسات ذرا آگے چل کر سامنے آئیں گے۔

———(٥)———

لیکن کسی مملکت میں قرآنی قوانین و احکام کو میکانکی طور پر نافذ کر دینے سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ مملکت کے اسلامی بننے کی اوّلین شرط یہ ہے کہ اس کے افراد میں حکمتِ قرآنی کے مطابق نفسیاتی تبدیلی واقع ہو۔ ان کے قلب و دماغ میں قرآنی خطوط پر تغیّر رونما ہو۔ یہ شرط

نفسیاتی تغیّر شرطِ اوّل

خود قرآن مجید کی عائد کردہ ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۱/۱۳)۔ "کسی قوم کی حالت کو، کوئی اور تو ایک طرف، خود خدا بھی نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے اندر، نفسیاتی تغیّر نہ پیدا کرلے۔" علّامہ اقبالؒ کا سارا پیغام، اسی تغیّر نفس کی شرح ہے جسے وہ تعمیر و استحکام خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ وہ (جاوید نامہ میں) کہتے ہیں کہ ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود   جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود!

"چوں بجاں در رفت" سے مراد، قرآنی حکمت کے مطابق نفسیاتی تبدیلی ہے۔ (تصوّف کا تزکیۂ نفس نہیں) خارجی تبدیلی اسی داخلی تبدیلی کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ اسی کو وہ فاش تر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ؎

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب!
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحبِ کشّاف   (بالِ جبریل)

انسانی ضمیر پر "نزولِ کتاب" سے مراد بھی، قرآن کے مطابق تغیّرِ نفس ہے۔ یہ مقصد، قرآنی حقائق کو اس طرح تعلیم و تربیت کی بنیاد بنا دینے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ اس سے افرادِ ملّت کا قلب و دماغ قرآنی سانچے میں ڈھل جائے۔ اسی لئے وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ ؏

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

"وہ تجھے ویسا انسان بنا دیتا ہے جیسا انسان خدا چاہتا ہے"۔ اور یہ مقصد احکامِ قرآنیہ کو میکانکی طور پر نافذ کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ؏

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

"یہ بات قانون سازوں کے بس کی نہیں"۔ یہ مقصد قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضور نبی اکرمؐ کا فریضہ ـــــ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ـــــ قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی آپؐ، کتاب و حکمت کی تعلیم سے افراد کی تعمیرِ خودی کرتے تھے۔ تشکیلِ مملکت کا مرحلہ تو اس سے کہیں بعد جا کر آیا تھا۔ اور قرآنی مملکت قائم بھی انہی افراد کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جن میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر پیدا ہو چکا ہو۔ حضورؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسی پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔ یعنی افراد کی تیاری جن کے ہاتھوں اس مملکت کو قائم ہونا تھا۔

ـــــــــــــــ (٠) ـــــــــــــــ

لیکن مملکت کا کاروبار تو بہرحال قوانین کی رو ہی سے چلنا ہے اس لئے اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور علامہ اقبالؒ نے بڑی شرح و بسط سے اس پر گفتگو کی ہے۔ اصولی طور پر وہ باصرار و تکرار اس حقیقت کو دہرائے جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآنِ کریم ہوگا۔ وہ اپنی پہلی مثنوی (اسرار و رموز) میں کہتے ہیں کہ ؎

ہیچ می دانی کہ آئینِ تو چیست ــــ زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ــــ حکمتِ او لایزال است و قدیم!

قرآن کا انداز

لیکن قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود متعین کر دیئے ہیں اور جزوی اور تفصیلی قوانین خود ہی مقرر نہیں کر دیئے۔ اسے اس کتاب کی وارث اُمت (یعنی ان کی مملکت) پر چھوڑا ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود و اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین میں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق، تبدیلی کی جا سکے گی۔

جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لئے ابدی اور غیر متبدل ضابطۂ راہ نمائی قرار پانا ہو، اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے علامہ اقبالؒ نے بڑی شد و مد سے دہرایا ہے۔ وہ خطباتِ تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبے میں) کہتے ہیں:-

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود، تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے

ثبات و تغیر کا امتزاج

> پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی تو وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے مطابق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــــ وہ

تغیّر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــــ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرّک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدّل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیّر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کونسا اصولِ حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کُلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو اور جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصوّر کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علاّمہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطّل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں:-

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہانے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخِ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی ایسی قوم نہیں جس کے پاس اس قدر

احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب وعلل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوو ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات وتاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو وخطا سے مبرّیٰ سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اِس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ

قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہوسکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ

تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کرسکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افتراء ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معیّن شکل اختیار کرلی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرّین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا ورغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی

اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:۔

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے۔ (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیّر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں ازبس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ

بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔

لیکن انہوں نے کہا کہ

با ایں ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرنِ اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔

(۰)

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث، کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداءِ فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علامہ اقبالؒ کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:۔

احادیث کی قانونی حیثیت

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہؐ

نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالم گیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب

تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنّن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضور نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدّل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے اِن اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعہ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکمِ خداوندی تھا کہ

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ..... (۳/۱۵۹) ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدّل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا، اور حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ..... (۴۲/۳۸) یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔

یہ طریقِ عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اُس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدّل رکھے جائیں گے۔ یہ تصوّر خلافتِ راشدہ کے بعد پیدا ہوا۔

احادیثِ رسول اللہؐ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدّل قرار دینے کا تصوّر امام مالکؒ اور اُن سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا ——— اس مسلک پر حنفی فقہا نے کڑی تنقید کی اور قیاس کو قانون کا ماٰخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی روٗ سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا ——— علامہ اقبالؒ اس کی نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:-

انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ

میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ و تشریح کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں:-

لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدّل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے اُن فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدّل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

(۰)

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدّل قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیّر و تبدّل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ

وہ سب سے بڑا سوال جو اِس وقت اُس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے' یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدّ و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

روحِ عمریؓ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:-

اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوّت کے) اس بنیادی تخیّل کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدّل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے' اور وہ

عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

(۰)

گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت اُسے کہا جائے گا جس میں تمام کاروبار مملکت قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائیں۔ یہ مملکت قائم بھی ان افراد کے ہاتھوں ہوگی جن کی سیرت قرآنی قالب میں ڈھل چکی ہوگی۔ اس مملکت میں قانون سازی کا اصول یہ ہوگا کہ قرآن مجید کے اصول، اقدار، قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور انہیں روبہ عمل لانے کے لئے جزئی قواعد زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ یہ قواعد خود اسلامی مملکت متعین کریگی۔

اس قسم کی حکومت قائم کرنے کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اس مملکت کے قیام کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ ہمارے دورِ ملوکیت میں جس قسم کا اسلام وجود پذیر ہو گیا تھا اسے مٹا کر اس کی جگہ قرآنی اسلام رائج اور نافذ کیا جائے۔ ہمارے دورِ ملوکیت کا اسلام ان فقہی احکام میں ملبوس چلا آرہا تھا جس کی علمبردار مذہبی پیشوائیت تھی۔ مذہبی پیشوائیت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ان فقہی احکام کو غیر متبدل قرار دیکر انہیں مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کیا جائے۔ اس انداز حکومت کو تھیا کریسی کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ نے بالفاظِ دیگر، مملکتِ پاکستان کا تصور اس لئے دیا تھا کہ مسلمانوں میں تھیا کریسی باقی نہ رہے۔ وہ تمام عمر تھیا کریسی کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔

تھیا کریسی کے خلاف

انہوں نے (مولانا) اکبر شاہ خان نجیب آبادی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔

> آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ (انشاءاللہ شائع ہوگا) مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ بہرحال اس تمام معاملہ کے متعلق مفصل گفتگو ہوگی جب آپ لاہور تشریف لائیں گے۔ ہندوستان میں بالخصوص آجکل بہت سوچ کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ (انوارِ اقبالؒ ۔ ص۲۱۷)

انہوں نے ۱۹۳۲ء میں (پاکستان کا تصور دینے کے بعد) اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری، ملّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ ادھام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے۔ اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنیوالے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ پھر وہ نئی آرزوؤں نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائیں۔ (بحوالہ طلوع اسلام مئی ۱۹۷۸ء)

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا تھا، اور قائدِ اعظمؒ کی مساعیٔ حسنہ نے اسے حاصل کر دکھایا تھا۔ اس کے بعد اس خطۂ زمین پر کیا بیتی، اس کے متعلق اقبالؒ کے ان الفاظ سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ

(۰)

ضرورت، قرآن کریم
کے نئے تراجم کی بجائے اس
کے صحیح مفہوم کی ہے!

طلوع اسلام کے اگست ۱۹۸۵ء کے شمارہ میں یوپی انڈیا کے (مولوی) محمد صاحب کا ایک مضمون بعنوان "قرآن مجید کے ایک نئے اردو ترجمے کی ضرورت"، بدیں غرض شائع کیا گیا تھا کہ اب مولوی صاحبان خود قرآن مجید کے ایک نئے ترجمے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں جبکہ اس سے قبل وہ اس کی یہ کہہ کر مخالفت کرتے رہے ہیں کہ پرانے اردو ترجموں سے بہتر ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ اس مضمون میں آیت 2:62 کا جو ترجمہ پیش کیا گیا تھا، طلوع اسلام نے اس کی نشان دہی کرتے ہوئے فٹ نوٹ میں لکھا تھا کہ اس آیت کے صحیح مفہوم کے لئے دیکھئے مفہوم القرآن جلد اوّل صفحہ ۲۲.... محترم سید عبدالودود صاحب نے جو علامہ پرویز صاحب مرحوم کے درسِ قرآن کے دورِ اوّل میں بالالتزام شریک ہوتے رہے تھے، ان کا کہنا ہے کہ طلوع اسلام کو غلط ترجمے کی نہ صرف نشاندہی کرنی چاہیئے بلکہ اس کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیش کرنا چاہیئے۔ پھر ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ قرآن کریم کے ترجمے کی نہیں بلکہ اس کے مفہوم کی ضرورت ہے۔ نہ صرف اردو میں بلکہ دیگر بین الاقوامی زبانوں میں بھی۔ ذیل میں ہم محترم موصوف کا اس موضوع پر ایک مضمون شائع کر رہے ہیں۔ تاہم اس سے قبل آیت 2:62 کا صحیح مفہوم، علامہ پرویز صاحب کے مفہوم القرآن سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کو بھی اسی مفہوم کی روشنی میں پڑھا جائے۔

(اے یہود!) تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ تم خدا کی چہیتی اولاد ہو ($\frac{5}{18}$) اور جنت تمہاری نسل کے لئے مخصوص ہے ($\frac{2}{111}$) — یہ تمہاری خام خیالی ہے — جنت کسی نسل کے لئے مخصوص نہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ، یہودی ہوں یا نصرانی۔ صابی ہوں یا وہ لوگ جو بغیر رسمی گروہ میں داخل ہوئے۔ ویسے ہی خدا کو مانتے ہیں — یا خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے — غرضیکہ کوئی بھی ہو، جو بھی خدا کے اقتدارِ اعلیٰ، زندگی کے تسلسل، اور اس قانونِ مکافات پر اُس طرح ایمان رکھے جس طرح اس قرآن میں بتایا گیا ہے۔ ($\frac{2}{137}$) اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے، تو اُن کے نشو ونما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق، ان کا اجر ملے گا، (جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) نہ کسی قسم کا خوف ان کے دامنگیر ہوگا۔ نہ حزن، وجہِ افسردگی بنے گا۔ (طلوع اسلام)

طلوع اسلام اگست ۱۹۸۵ء میں ایک مضمون بعنوان "قرآنِ مجید کے ایک نئے اردو ترجمے کی ضرورت" از مولوی محمد صاحب۔ رام پور۔ یو پی۔ انڈیا۔ نظر سے گزرا۔ مولوی صاحب نے

قرآن مجید کی چند آیات کو سامنے رکھ کر بعض مفسرین قرآن کی تفاسیر اور تراجم پر تنقید کی ہے اور انہیں غلط قرار دیا ہے۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے ان کی تحریر اچھی ہے اور اکثر زیرِ بحث آیات کے متعلق ان کا نقطۂ نظر درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعض جگہ وہ خود غلطی کر بیٹھے ہیں۔ ادارہ طلوع اسلام کا فرض ہے کہ جب کسی صاحب کے مضمون میں کوئی غلطی نظر آئے تو نہ صرف اس کی نشاندہی کی جائے بلکہ اس کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیش کیا جائے۔ مثال کے طور پر مولوی صاحب مذکور قرآن کریم کی آیت (۲:۶۲) کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دینِ خداوندی کا پیدائش سے کوئی تعلق نہیں کوئی شخص خواہ وہ مسلمان کے ہاں پیدا ہوا ہو یا یہودیوں کے گھر یا عیسائیوں کے ہاں یا صابئین کے گھر۔ کسے باشد جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور عملِ صالح کریگا تو ان لوگوں کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔

اس ضمن میں مولوی صاحب رقمطراز ہیں۔" وہ لوگ جو نبی اکرم پر ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابی (ان میں سے) جو بھی اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیئے ان کے لئے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ رنج ۔۔ تمام مترجمین نے اس آیت کا یہی ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کا عقیدہ راسخ ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ کوئی کیسا ہی موحد ہو اور اس نے کتنی ہی نیکیاں کیوں نہ کی ہوں اگر وہ مسلمان نہیں ہے تو اس کی ساری نیکیاں اکارت جائیں گی اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اس مضمون کی اکثر آیات ہیں جن میں غیر مسلموں کو بھی نجات کا حق دیا گیا ہے' ہمارے علماء کو غیر شعوری طور پر انکار ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ترجمہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن تشریحی نوٹ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی غیر مسلم کو خواہ وہ موحد ہو اور نیک کردار ہو نجات نہیں مل سکتی"۔

درحقیقت یہ آیت مدت تک زیرِ بحث رہی ہے اکثر بحث کرنے والے بات کو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا سکے تا آنکہ علامہ پرویز صاحب مرحوم نے اس نکتہ کو صاف کیا۔ اس آیت کو سمجھنے سے پہلے مندرجہ ذیل نکات کی وضاحت ضروری ہے۔ (۱) اللہ پر ایمان۔ کسی بلند و بالا ہستی کا تصور، کسی فوق البشر قوت کا احساس دنیا کے ہر خطے میں اور ہر قسم کے لوگوں میں موجود ہے لیکن اس ہستی کا تصور ہر جگہ جداگانہ ہے۔ چنانچہ یہودیوں کا یہوہ عیسائیوں کا فادر، ہندو دھرم کا ایشور یا ان کے ویدانت کا پرماتما، مجوسیوں کا یزدان ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں اور قرآن کا اللہ ان سب سے الگ ہے۔ اس لئے کہ گو ان مذاہب کے بانیوں نے خدا کی وہی صفات بیان کی ہونگی جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں لیکن بعد میں ان میں انسانی خیالات و

تصوّرات کی آمیزش ہوگئی۔ اور اس طرح مختلف مذاہب میں خدا کا تصوّر ایک دوسرے سے الگ ہوگیا۔ خدائے حقیقی ان صفات سے بالاتر ہے جنہیں ذہنِ انسانی نے تراش کر اس کی طرف منسوب کر رکھا ہے

خدا کا صحیح تصور اس کی ان صفات کی رُو سے سامنے آتا ہے جو قرآن کریم میں مذکور رہیں کیونکہ ان میں انسانی خیالات و تصوّرات کی آمیزش نہیں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ قرآن ان لوگوں کے ایمان کو ایمان باللہ تصوّر نہیں کرتا اور واضح طور پر کہتا ہے کہ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا (۲:۱۳۷) اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔

۲۔ ہر بچہ جو کسی مسلمان کے گھر پیدا ہوتا ہے وہ مسلمان کہلاتا ہے کیونکہ اس کے ماں باپ مسلمان ہوتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح پیدائشی مسلمانوں سے جو قوم وجود میں آتی ہے اس کی پوزیشن کیا ہے؟ اسے خود قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ وہ انہیں مِن حَيْث القوم مسلمان قرار دیتا ہے۔ یعنی اُمتِ محمدیہ کے افراد اور ان کا غیر مسلموں سے جداگانہ تشخص تسلیم کرتا ہے خود رسول اللہؐ کے زمانے میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی کہ صحابہ کبار تو عقل و فکر کی بنا پر سوچ سمجھ کر ایمان لائے تھے اس لئے ان کا شمار صحیح قرآنی مومنین کی صف میں ہوتا تھا۔ جب مدینہ میں اسلامی مملکت کی شان و شوکت اُبھری تو بہت سے اعرابی قبائل نے اس مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر اپنے آپ کو مومن سمجھنے اور کہنے لگے۔ قرآن کریم نے ان کو تنبیہ کی کہ ایسا مت کہو۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا (۴۹:۱۴) یہ بدوی قبائل کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (۴۹:۱۴)۔ ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے کیونکہ ایمان تمہارے دل میں داخل نہیں ہوا۔ تم صرف اس مملکت کے سامنے جھک کر اس قوم میں شامل ہوگئے ہو۔ وَإِن تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۴۹:۱۴) لیکن اگر تم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو تمہیں اپنے اعمال کا اس طرح بدلہ ملے گا جس طرح مومنین کو ملتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی۔ اور تمہیں بھی اس نظام کی طرف سے حفاظت اور ربوبیت کا سامان اسی طرح ملتا جائے گا جس طرح دوسروں کو ملتا ہے۔" چنانچہ تم اسلام کی صداقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اس طرح جب ایمان تمہارے ذہنوں میں داخل ہو جائے تو اس وقت کہو کہ تم مومن ہو گئے۔

مندرجہ بالا وضاحت کے بعد اب آئیے آیت (۲:۶۲) زیرِ بحث کی طرف۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی، نصاریٰ اور صابی ہیں ان میں سے جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور اس کے ساتھ عملِ صالح کرے گا تو ان لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ

اللہ کی طرف سے اس صورت میں ملے گا کہ ان پر کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ یہاں دیکھئے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ و صابئین کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اسی طرح الذین امنو کو بھی دی گئی ہے۔ اسی طرح قرآن ایک دوسری جگہ الذین امنو کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ (۴:۱۳۶) اے ایمان والو۔ ایمان لاؤ اللہ اس کے رسول اور اس کی کتاب پر۔ چنانچہ یہاں بھی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد مسلمان قوم کے افراد ہیں اور ان سے مخاطب ہو کر کہا جا رہا ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اعمالِ صالحہ کرو۔ چنانچہ بات بالکل واضح ہے کہ آیت (۲:۶۲) میں اللہ پر ایمان لانے اور اعمالِ صالحہ انجام دینے کا حکم سب کے لیئے برابر ہے۔ امتِ مسلمہ کے لئے بھی اور ان یہود و نصاریٰ و صابئین کے لئے بھی جو ابھی تک اس طریق پر ایمان نہیں لائے جس کا قرآن نے حکم دیا ہے۔

ضمناً اس سلسلے میں ایک بات اور وضاحت طلب رہ گئی ہے۔ مولوی محمد صاحب فرماتے ہیں،

"قرآن کی اکثر آیات میں غیر مسلموں کو نجات کا حق دیا گیا ہے۔ اور ہمارے علماء کو غیر شعوری طور پر اس کا انکار ہے۔،، اور پھر لکھتے ہیں کہ مودودی صاحب نے یہ کہا ہے کہ "کسی غیر مسلم کو خواہ وہ موحد ہو اور نیک کردار ہو نجات نہیں مل سکتی۔،، حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحبان چاہے مولوی محمد ہوں یا مودودی صاحب ہوں یا کوئی اور ہوں نجات کا لفظ ضرور استعمال کرتے ہیں حالانکہ نجات (CYCLIC ORDER OF LIFE) کا تصوّر غیر قرآنی ہے یہ ہندو مت کا تصوّر ہے جس میں آواگون کا چکر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اور قرآن مجید صراطِ مستقیم کا تصوّر پیش کرتا ہے اور صراطِ مستقیم بھی ایسا جس میں لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴:۱۹) ہو جس میں انسانی زندگی کی ارتقائی منازل ایک کے بعد دوسری اوپر کو اٹھتی چلی جائیں۔ آیت (۲:۶۲) میں کسی نجات کا ذکر نہیں۔ یہاں ذکر ایک معاشرے کے قیام کا ہے جس میں اللہ پر ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں خوف و حزن باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر ایک ہندو معاشرے کو لیجیئے، جس میں تکریم آدمیت کی بجائے ذات پات کی اونچ نیچ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں اگر چند افراد خوش خلق اور لین دین کے اچھے بھی ہوں تو وہ معاشرے کو اس سطح پر کیسے لا سکتے ہیں کہ اس میں خوف و حزن باقی نہ رہے۔ ہندوؤں کے علاوہ دوسرے معاشروں کو لیجئے وہاں معاشی اونچ نیچ اتنی زیادہ ہے کہ ہر طرف ایک اژدہا منہ کھولے بیٹھا ہے۔ اطمینانِ قلب کہیں نہیں ہر طرف حزن ہی حزن ہے۔

یہی خوف و حزن آج مسلمانوں کے اندر بھی موجود ہے۔ اور اس وقت تک قائم رہے گا جب تک ہم یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا کے حکم کے تحت دین کا نظام قائم نہ کر لیں۔

مندرجہ بالا نکتے کی وضاحت کے بعد اب دوبارہ اس موضوع کی طرف لوٹیئے کہ آیا

قرآن مجید کے ایک نئے اردو ترجمے کی ضرورت ہے یا نہیں ؟"

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے ترجمے کی نہیں بلکہ مفہوم کی ضرورت ہے اور وہ بھی صرف اردو میں نہیں بلکہ دیگر بین الاقوامی زبانوں میں بھی۔ اُردو زبان میں علامہ پرویز صاحب مرحوم آیات قرآنی کے مفہوم کا ایک بے بہا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں لیکن دیگر ممالک میں بیٹھے ہوئے مسلمان قرآن کے مفہوم کو انگریزی زبان میں دیکھنے کے لئے بے قرار ہیں۔ گو آج تک اردو اور انگریزی زبان میں قرآن کریم کے بہت سے ترجمے ہو چکے ہیں اور ان کے ذریعے قرآن کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے لیکن یہ تراجم ایسے نقائص سے لبریز ہیں جن کی زد قرآن کے بنیادی تصورات پر پڑتی ہے۔ قرآن کریم کے ترجمے میں جو بڑی مشکلات سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) قرآن کے الفاظ کا کسی بھی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا تو زیادہ موزوں ہوگا۔

" QURAN IS ESSENTIALLY UNTRANSLATABLE "

H. R. GIBBS, " MODERN TRENDS IN ISLAM. "

UNIVERSITY OF CHICAGO PRESS 1945, PAGE 4.

مثال کے طور پر لفظ اللہ کا ترجمہ ناممکن ہے۔ اگر اس کا ترجمہ GOD کیا جائے تو وہ عیسائیوں کے تصور کا خدا ہوگا اور اگر ترجمہ پرماتما کیا جائے تو وہ ہندوؤں کے تصور کا خدا ہوگا۔ ایک قرآنی لفظ سے نہ صرف اس لفظ کا مفہوم بلکہ کسی خاص آیت کے اندر اس کی ترتیب کے لحاظ سے اُس پوری آیت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سے پوری قرآنی تعلیم پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ قرآن کے الفاظ کو سمجھنے کے لئے ہر لفظ کے مادہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے قرآن کا (LITERAL) ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ دوسری چیز جو قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستے میں حائل ہوتی ہے وہ ہیں موجودہ تفسیریں جن میں مفسرین نے خودساختہ تصورات اور توہمات درج کر دیئے ہیں۔ اور (OLD TESTAMENT) سے یہودیوں کی بیان کردہ کہانیاں لے کر انہیں بڑی شدت اور تکرار کے ساتھ اپنی تفسیروں کا حصہ بنا دیا ہے۔ ان کے اس عمل سے قرآن کریم کی تعلیم پر ایک دُھند چھا گئی ہے۔ حالانکہ قرآن نے بڑی سختی سے اس عمل کو روکنے کے لئے کہا تھا۔ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ .... " اب حق تمہارے پاس آچکا ہے اس قسم کے حقائق مل جانے کے بعد لوگوں کے خیالات و خواہشات کے پیچھے مت چلو " اس کے علاوہ نئے مفسرین جو سامنے آتے ہیں وہ پہلی تفاسیر کو سامنے رکھ کر مکھی پر مکھی مارتے چلے جاتے ہیں۔ خود قرآن پر غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ قرآن کی تفسیر بیان کرنے کا یہ طریقہ غیر قرآنی ہے

زندگی کے ہر معاملے میں قرآن کی ہدایت واضح ہے چنانچہ قرآن کو بیان کرنے کے معاملے میں کہا گیا:۔
ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ۔(۷۵:۱۹) قرآن کو بیان کرنا ہماری ذمہ داری ہے گویا یہ خود قرآن کی طرف سے واضح ہدایت ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے کی جائے۔ قرآن کسی ایک موضوع کو مختلف جگہوں اور مختلف شکلوں میں بیان کر کے خود اس کی وضاحت کرتا جاتا ہے۔ جسے تصریف آیات کہا جاتا ہے وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِلنَّاسِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ ۔ (۱۸:۵۴) دیکھو ہم کس طرح اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لئے ہر قسم کی مثالیں لوٹا لوٹا کر بیان کرتے ہیں۔ تاکہ بات ہر گوشے اور ہر پہلو سے واضح ہو جائے۔ چنانچہ قرآن نے قرآن کی تفسیر کا طریق خود متعین کر دیا۔

قرآن کی تفسیر کا ایک اور اہم پہلو ہے۔ قرآن نے تسخیر کائنات کے لئے جد وجہد کرنے کی جابجا ہدایت دی ہے۔ وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ۙ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (۵۱:۲۰-۲۱) اور غور وفکر کرنے والوں کے لئے زمین میں نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہارے اندر بھی۔ تو پھر تم غور وفکر کیوں نہیں کرتے ؟" انسان جس قدر قوانین فطرت کا علم حاصل کرتا جائے اور کائنات کی تخلیق پر غور کرتا جائے اسی قدر اس کا یقین ان قوانین کے متعلق مستحکم ہوتا جاتا ہے جو انبیائے کرام کے ذریعے انسان کو اپنی صحیح معاشرت قائم کرنے کے لئے ملے ہیں قرآن دوسری جگہ زور دار الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ (۴۱-۵۳) ہم انسان کو کائنات کے اندر اور خود اس کے اپنے اندر اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے حتیٰ کہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ برحق ہے۔
لیکن کائنات کے اندر اللہ کی نشانیاں ان لوگوں کو کیسے نظر آئیں جنہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہوں۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نے تسخیر کائنات کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ اسی لئے کائنات کے اندر اللہ کی نشانیاں جو جابجا بکھری پڑی ہیں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ دوسری طرف آیاتِ قرآنی کا ⅛ حصہ وہ ہے جن میں کائنات کے متعلق اشارے موجود ہیں۔ ہمارے مفسرین اولاً تو ان آیات پر سے خاموشی سے گذر جاتے ہیں۔ اور انہیں اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ ان پر کچھ گفتگو کی جائے اور اگر ان کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسی مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں کہ ان کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔
یہ میں کسی تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا۔ میرے پاس اس کے متعلق ٹھوس حقائق موجود ہیں۔ چنانچہ میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ مندرجہ ذیل سطور میں کائنات کے متعلق جو نکات سامنے آئے ہیں انہیں میں صرف اشارات میں بیان کروں گا۔ ان کی تفصیل بے حد لمبی ہے جو ایک چھوٹے سے مضمون میں نہیں سما سکتی۔ اگر کوئی صاحب ان چیزوں کی تفصیل دیکھنے کے خواہشمند ہوں تو میری کتابوں (PHENOMENA OF NATURE AND THE QURAN.)

اور THE HEAVENS THE EARTH AND THE QURAN میں دیکھ سکتے ہیں) - یہ مثالیں میں زیادہ تر مودودی مرحوم کی تفسیر تفہیم القرآن کو سامنے رکھ کر پیش کردوں گا - کیونکہ وہ ایک نامور مفسر مانے جاتے ہیں -

۱- قرآن کریم نے تخلیقِ کائنات کے ارتقائی مراحل کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر مرحلے کا نام یوم رکھا ہے چنانچہ کہا گیا ہے اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط... (۳۲ : ۴) اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ ایام میں پیدا کیا - (یعنی چھ مختلف ادوار میں سے گذارا اور اس کو یہ شکل عطا کی جو تمہارے سامنے ہے) - اور اس کے نظام کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا - پھر اس سے اگلی آیت میں کہا، یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲ : ۵) اس کا طریقِ تخلیق یہ ہے کہ اس کے عالمِ مشیت میں ایک سکیم سامنے آتی ہے - وہ اس سکیم کا آغاز پست ترین نکتہ سے کرتا ہے - (اور وہ کائناتی عناصر کے باہمی تعاون سے نشوونما پاتی ہوئی ارتقائی منازل طے کرتی جاتی ہے) اور اس طرح آہستہ آہستہ اس نکتۂ تکمیل کی طرف اٹھتی اور بڑھتی جاتی ہے جو اللہ نے اس کے لئے مقرر کیا تھا - ان ارتقائی مراحل کی مدت تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے - دوسری جگہ کہا کہ پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے (۷۰ : ۴) قرآن کریم نے جو ہزار ہزار سال یا پچاس پچاس ہزار سال کا ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے یوم ایک بہت لمبی مدت کا نام ہے -

مودودی مرحوم ارتقا کے قائل ہی نہیں تھے ان کا (THEORY OF SPECIAL CREATION) پر ایمان تھا یعنی جو چیزیں آج ہمیں نظر آرہی ہیں وہ ابتدا میں اسی صورت میں پیدا ہوئی تھیں اور شروع سے اب تک اسی صورت میں چلی آرہی ہیں - وہ آیت (۳۲ : ۵) سے کوئی سبق حاصل نہیں کر سکے - آیت (۳۲ : ۴) میں جو سِتَّةِ ایام یعنی چھ ادوار کا ذکر آیا ہے ان کے متعلق انہوں نے اپنی تفسیر میں کوئی ذکر نہیں کیا کہ یہ کیا ہیں - حالانکہ فی زمانہ یہ ایک طویل اور دلچسپ موضوع ہے - اسی آیت (۳۲ : ۴) میں وَمَا بَیْنَهُمَا کے الفاظ آئے ہیں - مودودی مرحوم نے اس کا ترجمہ کیا ہے - "ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں -" لیکن اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا کہ جو چیزیں آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں ان کی حقیقت کیا ہے - بس ایک غیر ضروری بات سمجھ کر آگے گذر گئے - حالانکہ قرآن میں جہاں بھی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے الفاظ آئے ہیں اکثر ان کے ساتھ وما بینھما کے الفاظ آئے ہیں - مثلاً (۸۵ : ۸۳) (۶۰ : ۲۰) (۵۹ : ۲۵) (۷ : ۴۴) (۸۵ : ۱۵) (۳ : ۴۶) (۳۸ : ۴۴) ہیں - قرآن جو تکرار کے ساتھ ان الفاظ کو سامنے لا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی اہم چیز ہے -

اور حقیقتاً یہ چیز بڑی اہم ہے اور فی زمانہ اس نے سائنس کی دنیا میں بڑی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مختلف آسمانی کرّوں کے درمیان اور ان کرّوں اور زمین کے درمیان جو جگہ ہے وہ بالکل خالی ہے لیکن موجودہ سائنس کی تحقیق نے یہ دریافت کیا ہے کہ یہ جگہ خالی نہیں ہے بلکہ اس میں گیس اور ذرّات (INTERPLANATORY GAS AND DUST) موجود ہیں۔ ان گیس اور ذرّات کی دریافت سے جو ۱۹۵۰ء سے شروع ہوئی تخلیق کائنات کے بہت سے مراحل سمجھنے میں آسانی ہوگئی ہے۔ اور یہ بھی سمجھ میں آیا ہے کہ شروع میں گیس اور ذرّات کے اس ہیولے سے جسے قرآن دخان کہتا ہے ستارے کس طرح معرض وجود میں آئے اور یہ حیران کن بات ہے کہ سائنسدانوں نے یہ چیز ۱۹۵۰ء میں دریافت کی اور قرآن نے آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے اس کا جگہ بہ جگہ ذکر کیا۔ اور ہمارے مفسرین ان الفاظ کو فالتو سمجھتے چلے آرہے ہیں۔

۲۔ قرآن نے تخلیق کے چھ ادوار کو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دو ادوار جن میں تمام آسمانی کرّے بمع زمین معرض وجود میں آئے۔ ان کو قرآن نے یومین کہا ہے۔ (۴۱:۹) سائنس ان کو (AZOIC PERIOD) کہتی ہے یعنی وہ دور جب ابھی زندگی کی نمود نہیں ہوئی تھی میں نے اپنی کتاب (THE HEAVENS THE EARTH AND THE QURAN) میں اس نکتہ کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن نے اس لمبے عرصے کو جو کہ قریباً ۳۰۰۰ ملین سالوں پر مشتمل ہے یومین کیوں کہا ہے۔ مودودی مرحوم نے یومین کا ترجمہ ۴۸ گھنٹے کیا ہے یعنی یوم سے ان کی مراد ۲۴ گھنٹے کا دن ہے۔ گویا ان کے نزدیک کائنات بعد میں معرض وجود میں آئی اور دن اور رات اس سے پہلے بن چکے تھے۔ چنانچہ وہ تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۴۴۶ پر لکھتے ہیں "تب اس نے دو دن میں سات آسمان بنا دیئے" اور اس کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں۔ "ادھر حکم ہوا اور ادھر وہ مواد سکڑ اور سمٹ کر فرمانبرداروں کی طرح اپنے مالک کے نقشے پر ڈھلتا گیا۔ یہاں تک کہ ۴۸ گھنٹوں میں زمین سمیت ساری کائنات معرض وجود میں آگئی۔" سِتَّةِ اَيَّامٍ میں سے پہلے دو ادوار کے بعد باقی چار ادوار جن میں زندگی معرض وجود میں آئی۔ انہیں قرآن نے اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ کہا ہے۔ مودودی مرحوم نے ان چار ایام کی وضاحت کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ حالانکہ یہ قریباً ۲۰۰۰ ملین سالوں کی طویل اور دلچسپ داستان ہے۔ لیکن مودودی مرحوم کے حساب سے چار ایام کے صرف ۹۶ گھنٹے بنتے ہیں۔ ان ۹۶ گھنٹوں میں ان گنت قسم کے پودے اور جانور جو معرض وجود میں آئے ان کی تفصیل کیا ہے اس پر آپ بالکل خاموش ہیں۔

۳۔ سائنس نے زمین کی عمر ۵۰۰۰ ملین سال مقرر کی ہے۔ جن میں سے ۳۰۰۰ ملین سال یومین میں گذرے جب کوئی زندہ شے موجود نہیں تھی۔ ارتقا اس دوران بھی جاری رہی اور یہ صرف

(CHEMICAL EVOLUTION) کیمیائی ارتقاء تھی۔ اس دور کے اختتام پر ایسے کیمیائی اجزاء معرضِ وجود میں آ چکے تھے جن میں زندگی کی نمود ممکن ہو گئی۔ ضمناً مختصر طور پر یہ بھی واضح کر دوں کہ ستۃ ایام میں سے ہر ایک کی مدت کیسے مقرر کی گئی۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ زمین پر پتھروں کی تہیں جمتی گئیں اور مردہ جانور اور درخت جو زمین میں دبتے چلے گئے وہ زمین کے اندر گرمی کی شدت اور دباؤ کی وجہ سے سخت ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ یہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے اور پتھروں کا حصہ بن گئے۔ لیکن ان کی اصلی ساخت برقرار رہی۔ ان زمین کی تہوں کے اندر دبے ہوئے جانوروں اور درختوں کو (FOSSILS) کہتے ہیں۔ ان (FOSSILS) کی عمر کیمیائی اور (RADIO-ACTIVE) ذرائع سے معلوم کی جاتی ہے اور یہ اس قدر صحیح ہوتی ہے کہ اس میں غلطی کا امکان باقی نہیں رہتا۔

یومین کے بعد اَرْبَعَةِ ایام میں پہلا یوم (دور) وہ تھا جس میں حیوانات اور نباتات صرف ایک (CELL) پر مشتمل تھے۔ اس یوم کی مدت ۱۵۰۰ ملین سال تھی۔ اس یوم کے (FOSSIL) آج بھی موجود ہیں۔ اس سے اگلا دور ۳۰۰ ملین سال کا تھا جس میں بڑے بڑے درخت اور سمندری حیوانات پیدا ہوئے۔ اس دور کی زندہ اشیاء صفحہ ہستی سے مٹ گئیں لیکن ان کے (FOSSIL) موجود ہیں۔ اس سے اگلا دور ۱۳۰ ملین سال کا ہے جس میں سطح زمین پر بہت بڑے جانور پیدا ہوئے ان میں ایک ایسا بھی تھا جس کا وزن ۳۵ ٹن تھا اور جس کی لمبائی ½ ۸۷ فٹ تھی۔ یہ بھی ناپید ہو گئے لیکن ان کے (FOSSIL) بھی آج موجود ہیں۔ اس کے بعد آخری دور آیا جس میں وہ تمام حیوانات اور نباتات معرضِ وجود میں آئیں جو آج ہمیں نظر آ رہی ہیں اس یوم کی عمر اس وقت ۷۵ ملین سال ہے۔ اس پچھلے دور میں پرندے اور دودھ دینے والے جانور پیدا ہوئے اور انسان بھی ان میں سے ایک ہے۔ انسان کی تخلیق کی ابتدا آج سے ۲۸ ملین سال پہلے ہو چکی تھی۔ اس دور میں انسان بتدریج حیوان سے انسان بنتا چلا گیا۔ انسانی ارتقا کی ہر سطح کے (FOSSIL) زمین کے اندر موجود ہیں۔ سائنس کی رُو سے مہذب انسان کا آغاز اس سطح پر ہوتا ہے جب اس نے اوزار (TOOLS) بنانے شروع کئے۔ یعنی یہ وہ وقت ہے جب انسان نے تسخیر کائنات شروع کی۔

یومین میں جو کیمیائی ارتقا ہوئی اس میں کیمیائی اجزاء بالآخر اس قابل ہو گئے کہ ان میں زندگی کی نمود ممکن ہو گئی اور جو بتدریج انسان کی سطح تک آ گئی۔ اس کیمیائی ارتقاع کو قرآن کریم نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ (۴۰:۶۷)
وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا (۲۵:۵۴) اور وہی تو ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ---- (۶:۲) وہی تو ہے جس نے تم کو گیلی مٹی سے پیدا کیا۔

إِنَّا خَلَقْنٰهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ (۱۱ : ۳۷) بیشک ہم نے ان کو چپکتی ہوئی گیلی مٹی سے پیدا کیا۔
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ (۲۳:۱۲) ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا
خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ۔ (۱۴ : ۵۵) انسان کو اسنے قریباً ٹھیکری جیسے گارے سے بنایا؛
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۔ (۲۶ - ۱۵) ہم نے انسان کو ایک ایسے طبیعاتی تغیر پذیر گارے سے بنایا جو وقت گذرنے کے بعد خشکی کی ایک حد تک پہنچ چکا تھا۔

یہ آیات قرآن کے مختلف حصوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ اور ان کو یکجا کرنے کے بعد کیمیائی ارتقا کا ایک خوبصورت نقشہ سا سامنے آتا ہے۔ ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے مٹی کا ایک گھگو بنایا اس میں پھونک ماری، بابا آدم بن گیا۔ اس کی پسلی چیری، اندر سے اماں حوّا نکل آئی۔ وہ ایسی بے تکی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ بائیبل میں ایسا ہی لکھا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ انسان مٹی کے پتلے سے نہیں مٹی کے ست سے پیدا ہوا۔ اور یہ مٹی (مٹی کا ست) سُلٰلَةٍ مِّن طِينٍ کی کہانی در حقیقت ۳۰۰۰ ملین سال کے کیمیائی ارتقا کی کہانی ہے۔ ہمارے علماء حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (۲۶ : ۱۵) کا ترجمہ بدبو دار گارا کرتے ہیں، حالانکہ (PUTRIFACTION) سڑاند ایک (BIOLOGICAL) فعل ہے۔ سڑاند یا بدبو زندگی کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد پیدا ہوئی۔ یعنی جب (BACTERIA) وغیرہ پیدا ہو چکے تھے۔ حَمَإٍ مسنون سے مراد اشیاء کے اندر صرف کیمیائی اور طبعی تغیرات ہیں۔

(۴) مودودی مرحوم آیت (۷ - ۸ : ۳۲) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تفہیم القرآن جلد ۴ صفحہ ۴۰ پر لکھتے ہیں۔ "اگر ایک دفعہ مان لیا جائے کہ پہلا جرثومہ براہ راست تخلیق سے معرضِ وجود میں آیا تو پھر آخر یہ ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوعِ انسانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا اور پھر اس کی نسل تناسل کی تشکیل میں آگے بڑھی" اس قسم کی تفسیر کیمیائی ارتقاء سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ پہلے ایک غلط مفروضہ بیان کیا کہ پہلا جرثومہ براہ راست معرضِ وجود میں آیا۔ پھر اس پر غلط استدلال کی عمارت استوار کرنی شروع کر دی۔ یہ بھی ایک غلط تصور ہے کہ براہِ راست ایک مرد بنایا اس کی پسلی چیر کر ایک عورت نکالی اور اس کے بعد فوراً تناسل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حیوانات اور نباتات کے اندر (REPRODUCTION) کا سلسلہ اربوں سال تک بغیر (SEX) کے جاری رہا۔ پھر یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ (SEX) صرف تولید کے عمل کے لئے معرضِ وجود میں آئی۔ در حقیقت (SEX) تولید کے لئے نہیں بلکہ (ADAPTATION) کے لئے شروع ہوئی۔ (SEX) کیسے پیدا ہوئی ہے، ایک مثال سے سمجھئے۔ ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر جو سبز رنگ کی کائی جم جاتی ہے یہ چھوٹے چھوٹے نباتاتی دھاگے ہیں۔ کائی کے ہر دھاگے میں (CELLS) کی ایک لمبی قطار ہوتی ہے۔ برف کے موسم میں چھوٹے چھوٹے نباتاتی (CELLS) موسم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ایک دھاگے کا ایک (CELL) دوسرے دھاگے کے ایک سیل کے قریب ہو جاتا ہے اور ایک (CELL) کا مواد دوسرے (CELL) میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یعنی دونوں مل کر ایک (CELL) بنا دیتے ہیں

اور اس ایک (CELL) کے گرد سخت خول بن جاتا ہے جو اسے سردی سے روکتا ہے۔ سردی کے موسم میں باقی تمام (CELL) مر جاتے ہیں صرف ایک خول والا (CELL) زندہ رہتا ہے۔ موسم بہار میں خول پھٹ جاتا ہے اور اندر سے ایک نیا پودا نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا (SEX) ناموافق ماحول کا مقابلہ کرنے کے لئے معرضِ وجود میں آئی۔

(۵) ہر مرتبہ ایک نئی زندگی کی نمود ایک واحد سیل سے ہوتی ہے، جسے قرآن نے نفسِ واحدۃ کہا ہے۔ انسان کو لیجئے۔ ایک مرد کا (male cell) یا (SPERMATAZOA) ایک عورت کے (FEMALE CELL) یعنی (OVUM) سے مل کر ایک واحد سیل بنتا ہے جس کا نام (ZYGOTE) ہے۔ یہ (CELL) پرورش پا کر نر انسان بھی بن سکتا ہے اور مادہ انسان بھی۔ اس میں دونوں صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔

یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ پہلے دنیا میں ایک (cell) پیدا ہوا پھر اس سے زندگی مختلف مراحل طے کرتی ہوئی انسان تک پہنچ گئی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنے (cells) پہلے پہل ساحلِ سمندر پر پیدا ہوئے جن سے زندگی آگے بڑھی۔ جس چیز کو قرآن نے نفسِ واحدۃ کہا ہے وہ یہی (ZYGOTE) جس سے ہر انسانی یا حیوانی زندگی شروع ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ (۳۱:۲۸) تمہاری تخلیق اور پھر دوبارہ زندگی ایک نفس واحد کے ذریعے ہے؟ یہ سائنس آف بائیالوجی کا دلچسپ موضوع کہ کوئی زندہ شے چاہے ایک (cell) کی بنی ہوئی ہو یا کروڑوں (cells) کی بنی ہوئی ہو، اس کا آغاز نفسِ واحدۃ سے ہوتا ہے۔

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا ... (۳۹:۶) اس نے تمہیں ایک نفسِ واحدۃ سے پیدا کیا اور اسی میں سے تمہارے زوج بنائے۔ یعنی نر بھی اور مادہ بھی دونوں اسی ایک (cell) کے اندر سے بنتے ہیں۔ مخالف صنف ایک ہی cell کی پیداوار ہوتے ہیں۔

(۶)۔ زمین پر زندگی کی ابتدا کے بعد حیوانات اور نباتات درختوں کی شاخوں کی طرح آگے پھیلتے گئے جو نئے نئے ماحول اور واقعات کا مقابلہ نہ کر سکے وہ ناپید ہوتے گئے جو نئے حالات اور ماحول کا مقابلہ کرتے گئے وہ نئی نئی شکلیں اختیار کر کے آگے بڑھتے گئے۔ گویا یہ نباتات اور حیوانات کی مختلف قسموں کا پھیلاؤ ایک درخت کی شاخوں کی طرح ہوتا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم نے کہا وَاللَّهُ أَنبَتَكُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا (۷۱:۱۷) اللہ تعالیٰ کی تدابیر نے تمہیں درخت کی شاخوں کی طرح اوپر کو اٹھایا۔

مودودی مرحوم اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: "اور اللہ نے تمہیں زمین سے عجیب عجیب طرح سے اگایا"۔ (تفہیم القرآن جلد ۶ صفحہ ۱۰۲) پھر صفحہ ۱۰۳ پر اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ "یہاں زمین کے مادوں سے انسان کی پیدائش کو نباتات سے اگنے سے تشبیہ دی ہے جس طرح اس کرّے پر کسی وقت نباتات نہیں تھیں اور پھر اللہ نے انہیں اگایا۔ اب اس قسم کی تفسیروں سے کوئی کیا سمجھے؟

(۷)۔ قرآن کریم ماں کے پیٹ کے اندر جنین کی مختلف (STAGES) بیان کرتا ہے اور کہتا ہے۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً :(۲۳ : ۱۴) نطفہ سے ہم نے علقہ بنایا۔ علقہ کا ترجمہ ہر مفسر نے جما ہوا خون کیا ہے۔ حالانکہ اس ابتدائی مرحلے پر جنین کے اندر خون نہیں ہوتا۔ یہ صرف ابتدائی خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے (ZYGOTE) یا نفس واحدۃ ایک سے دو، دو سے چار خلیوں میں تقسیم ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے اور ایک ہفتے کے اندر یہ ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ باہر ایک خول ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک چیز لٹکی ہوئی ہوتی ہے اسے اناٹومی کی اصطلاح میں (BLASTOCYST) کہتے ہیں یہ چیز صرف خوردبین سے نظر آسکتی ہے اس خلیوں کے مجموعے کے اندر نہ اپنا خون ہوتا ہے اور نہ ہی یہ ابھی رحم مادر تک پہنچا ہوتا ہے جہاں اس نے ماں کے خون سے وابستہ ہونا ہوتا ہے۔ علقہ مادہ ع ل ق کے معنی ہیں کسی شے کا لٹکی ہوئی حالت میں ہونا۔ معلق کا لفظ ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے جب آپ خوردبین کے ذریعے (BLASTOCYST) کو دیکھتے ہیں تو پہلی نظر میں آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جسے قرآن نے علقہ کہا ہے۔

(۸) قرآن کہتا ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۔ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (۸۱ : ۱۶) ہم شہادت پیش کرتے ہیں خنّس اور جوار الکنّس کی۔ مودودی مرحوم نے ان الفاظ کی وضاحت نہیں کی لیکن ان کا ترجمہ " پلٹنے جھپنے والے ستارے" کیا ہے۔ اور بعض مفسروں نے اسکا ترجمہ ستاروں کا طلوع اور غروب کیا ہے۔ (COMET) نظام شمسی کے کرّوں کی ایک قسم ہے۔ یہ بھی زہرہ، زمین، عطارد، مشتری اور زحل کی طرح سورج کے گرد چکر لگاتا ہے۔ لیکن جس مدار میں یہ گھومتا ہے وہ گول نہیں ہوتا بلکہ بہت لمبی بیضوی شکل کا ہوتا ہے اس لئے وہ آسمان پر کچھ عرصہ ظاہر ہونے کے بعد برسہا برس تک پھر نظر نہیں آتا۔ مثال کے طور پر (HAILEYS COMET) کو لیجئے یہ ۷۶ سال میں سورج کے گرد اپنا چکر پورا کرتا ہے اور اب ۱۹۸۶ء میں آسمان پر ظاہر ہونے والا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے خنّس اور جوار الکنّس کے الفاظ استعمال کیئے ہیں خنّس کے معنی ہیں خاموشی سے پیچھے ہٹ جانا۔ جوار مادہ ج ر ی کے معنی ہیں بغیر کسی روک ٹوک کے تیزی سے حرکت جاری رکھنا۔ کنّس کے معنی ہیں چھپ جانا۔ چنانچہ قرآن کریم نے جن کرّوں کو خنّس اور جوار الکنّس کہا ہے وہ سوائے (COMETS) کے اور کوئی ہو نہیں سکتے۔ چنانچہ ان کو " پلٹنے جھپنے والے ستارے" کہنا بے معنی بات ہے اول تو انہیں ستارے کہنا ہی غلط ہے۔ یہ ستارے نہیں ہیں یہ نظام شمسی کے حصّے ہیں۔

اسی طرح ہمارے مفسرین نے آیاتِ قرآنی کے سمجھنے میں بے شمار غلطیاں کی ہیں۔ جن کو اس چھوٹے سے مضمون میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ بہرحال یہ غلطیاں سائنس کے مضامین سے لاعلمی کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں اور یہ ہمارے علماء کے بس کی بات نہیں کہ ان مقامات کا صحیح مفہوم بیان کر سکیں۔ لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایسی آیاتِ قرآنی جو کائنات کے متعلق نہیں ہیں۔ ان کے بیان کرنے میں بھی ہمارے علماء بعض اوقات ایسی قابلِ نفرت باتیں کرتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ ان

تفاسیر میں وہ بائیبل میں درج کہانیوں کو بغیر سوچے سمجھے نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیت (۳۸ : ۱۷ : ۲۴) کو لیجئے جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"ہمارے بندے داؤدؑ کو یاد کرو جو صاحب قوت تھا اور ہمارے قوانین کی اطاعت میں بڑا تیز خرام تھا اس کی ترقیوں کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے سرکش پہاڑی قبائل اس کے محکوم تھے جو دن رات اس کے پروگرام کی تکمیل میں اس کے ساتھ سرگرم عمل رہتے تھے اور قبیلہ طیر کے خانہ بدوش منتشر افراد اس کے ہاں جمع کر دیئے گئے تھے جن سے اس کا لشکر مرتب ہوتا تھا اور اس طرح ہم نے اس کی سلطنت کو بڑا محکم بنا دیا اور اسے وحی کی دانش نورانی عطا کی اور نیز معاملات میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے کا فہم۔ بھلا تمہارے پاس ان جھگڑا کرنے والوں کی بھی خبر آئی؟ جب وہ دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے (یعنی داؤد علیہ السلام کی قوم بڑی جاہل اور وحشی تھی معاشرت کے آداب سے بھی واقف نہیں تھی وہ اپنے معاملات ان کے سامنے پیش کرنے کے لئے آتے تو نہ وقت دیکھتے اور نہ راستہ) جس وقت وہ داؤدؑ کے پاس آئے تو وہ گھبرا گیا۔ انہوں نے کہا خوف نہ کیجئے، ہم دونوں کا ایک مقدمہ ہے کہ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے تو آپ ہمارا انصاف سے فیصلہ کر دیجئے اور بے انصافی نہ کیجئے اور ہم کو سیدھا راستہ دکھا دیجئے۔ (کیفیت یہ ہے) کہ یہ میرا بھائی ہے اس کے (ہاں) ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے یہ کہتا ہے کہ یہ بھی میرے حوالے کر دو اور گفتگو میں میرے ساتھ زبردستی کرتا ہے۔ انہوں نے کہا یہ تیری دنبی مانگتا ہے کہ اپنی دنبیوں میں ملا لے۔ بیشک تم پر ظلم کرتا ہے اور (کاروبار میں) اکثر شریک لوگ ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ اور داؤدؑ نے خیال کیا کہ اس واقعہ سے ہم نے اس کو آزمایا ہے۔ انہوں نے اپنے پروردگار سے مغفرت مانگی اور جھک کر گر پڑے اور اللہ کی طرف رجوع کیا۔" قرآن کریم نے ان آیات میں جس مقدمہ کا ذکر کیا ہے وہ خالص معاشی مسئلہ ہے۔ ایک شخص کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور دوسرے کے پاس صرف ایک جو اس کے معاش کا ذریعہ ہے۔ پہلا شخص دوسرے شخص کی ایک دنبی بھی حاصل کر کے اپنے ریوڑ میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ داؤد علیہ السلام نے فیصلہ دیا کہ یہ شخص سراسر ظلم کر رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ کہ جب بھی لوگ مل کر شراکت کا کاروبار کرتے ہیں تو ان میں اکثر کی یہی حالت ہوتی ہے سوائے ان لوگوں کے جو اللہ پر ایمان لائے اور معاشرے کو سنوارنے کے کام کرتے رہے۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں (قَلِیْلٌ مَّا هُمْ) لیکن داؤد علیہ السلام نے جب اس معاملہ کی گہرائی پر غور کیا تو یہ حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی کہ یہ معاملہ صرف دنبیوں کا نہیں یہ اس غلط معاشی نظام کا سوال ہے جس میں بڑا سرمایہ دار چھوٹے سرمائے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ ان کا فریضہ

ہے کہ اس غلط معاشی نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کریں چنانچہ وہ اپنی اس کوتاہی پر نادم ہوئے اور سجدہ میں گر پڑے اور اللہ سے سامانِ حفاظت طلب کیا جس سے وہ معاشرے کے اندر صحیح معاشی نظام قائم کر سکیں۔

اب آیئے اس خرافات کی طرف جو یہودیوں نے صموئیل دوم باب ۱۱-۱۲ میں درج کی ہیں اور ہمارے مفسرین نے یہودیوں کی نقل کر کے انہیں اپنی تفسیروں میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ صموئیل دوم میں کہا گیا ہے:۔ "ایک روز شام کے وقت داؤدؑ اپنے محل کی چھت پر ٹہل رہا تھا کہ اس کی نظر ایک عورت پر پڑی جو نہا رہی تھی۔ بے حد خوبصورت عورت تھی۔ داؤدؑ نے دریافت کرایا کہ یہ کون ہے معلوم ہوا بت سبع بنت الیام اس کا نام ہے اُوریا حتی کی بیوی ہے۔ داؤدؑ نے اسے بلا بھیجا اور رات اپنے پاس رکھا اسی رات وہ حاملہ ہو گئی اور بعد میں داؤد کو اس نے اپنے حمل کی اطلاع دیدی۔ اس کے بعد داؤدؑ نے اُوریا کو یوآب کے پاس بھیج دیا جو اس وقت بنی عمون سے لڑنے کے لئے گیا ہوا تھا اور شہر ربہ کا محاصرہ کئے پڑا تھا اس نے یوآب کو لکھا کہ اُوریا کو جنگ میں کسی ایسی جگہ مامور کرو جہاں سخت معرکہ ہو اور پھر اس کو اکیلا چھوڑ کر الگ ہو جاؤ کہ وہ مارا جائے چنانچہ یوآب نے ایسا ہی کیا اور وہ مارا گیا۔

اس طرح اُوریا کو ٹھکانے لگانے کے بعد داؤدؑ نے اس عورت سے نکاح کر لیا اور اس کے پیٹ سے حضرت سلیمانؑ پیدا ہوئے۔ خدا کو داؤد علیہ السلام کا یہ فعل ناگوار گزرا اور اس نے ناتن نبی کو داؤدؑ کے پاس بھیجا۔ ناتن نے ان سے کہا کہ ایک شہر میں دو شخص تھے۔ ایک مالدار تھا دوسرا فقیر۔ مالدار شخص کے پاس بہت سی بکریاں اور گائیں تھیں۔ اور فقیر کے پاس صرف ایک چھوٹی سی دنبی تھی جس کو وہ بڑی محبت سے پالتا تھا۔ ایک مرتبہ مالدار شخص کے پاس مہمان آئے اس نے چاہا کہ اپنی بکریوں میں سے کسی کو نہ کاٹے۔ فقیر کی دنبی لے لی اور اس سے ضیافت کا سامان کیا۔ یہ قصہ سن کر داؤد بہت غضبناک ہوا اور کہا کہ ایسا شخص ضرور مارا جائے گا۔ اور فقیر کو ایک کے بدلے چار دنبیاں دلوائی جائیں گی۔ ناتن نبی نے کہا کہ وہ شخص تو تُو ہی ہے۔ اور اسے اوریا حتی کا واقعہ یاد دلایا۔"

ہمارے مفسرین نے آیت (۲۴-۱۷-۲۸) کی جو تفسیر بیان کی ہے وہ اسی قصے پر مشتمل ہے۔ ان کے نزدیک داؤد علیہ السلام نے جس گناہ کے لئے توبہ کی تھی وہ یہی زنا کا گناہ تھا۔ مودودی مرحوم نے اس قصے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور تفہیم القرآن جلد ۴ صفحہ ۳۲۹ پر کہا ہے کہ اکثر مفسرین نے اس قصہ کو پوری طرح تسلیم کیا ہے اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے اس کا کچھ حصہ تسلیم کیا ہے۔ مودودی مرحوم نے اپنے تفصیلی تبصرہ میں داؤد علیہ السلام پر زنا کے الزام کی تردید کی ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس شرمناک لیکن لذت دار افسانے کو یکلخت رد نہیں کیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "ان کے بیان سے واقعہ کی حقیقت یہ معلوم ہوتی

ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام نے اُوریا حتی سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور ان کی شخصی عظمت کو پیشِ نظر رکھ کر وہ اس طرح اپنے آپ کو طلاق پر مجبور پا رہا تھا" نہ معلوم مودودی مرحوم نے کونسے قرآن میں یہ قصہ لکھا ہوا دیکھا تھا؟ قرآن نے صرف ایک معاشی مسئلہ بیان کیا ہے۔ داؤد علیہ السلام ایک پیغمبر تھے اور ان کے متعلق قرآن نے جو آیت (۱۷: ۳۸) میں الفاظ استعمال کیے ہیں وہ ہیں۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ‎۳۸/۱۷ ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو صاحبِ قوت تھا اور ہمارے قوانین کی اطاعت میں بڑا تیز خرام تھا۔ اَوّاب کے معنی ہیں تیزی سے قانونِ خداوندی کی طرف دوڑنے والا۔ اطاعت گذار۔ اب ایسے اولوالعزم انسان کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے کسی دوسرے شخص کی بیوی کو اس سے طلاق دلوا کر خود حاصل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اگر خرافات نہیں تو اور کیا ہے۔ زنا کا الزام تو ایک بہت بڑی بات ہے اور یہود اپنی قوم کے دیگر انبیاء پر بھی ناپاک الزامات لگاتے رہے ہیں۔ لیکن ایک پیغمبر کے متعلق یہ شک ظاہر کرنا کہ اس نے کسی دوسرے شخص کی بیوی پر بُری نظر رکھی تھی یہ بھی کوئی کم گھٹیا بات نہیں۔ یہ صورت ہے ہمارے مفسرین کی تفسیروں کی جو میں نے اوپر بیان کی ہے۔ درحقیقت قرآن کو سمجھنے کا صحیح طریق ایک ہی ہے یعنی قرآن کے ذریعے قرآن کی تفسیر۔ ورنہ انسانی تخیلات اور تصورات میں الجھ کر آیت کا مفہوم کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔

علامہ پرویز مرحوم قرآن سے قرآن کی تفسیر کے داعی تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کی تفسیر مطالب الفرقان اردو زبان میں ہے اور دیگر ممالک کے مسلمان نہ صرف اس طریق تفسیر کو دیکھنے کے خواہشمند ہیں بلکہ اس کے لئے بیقرار ہیں۔ مجھے اکثر انگلینڈ اور افریقہ کے ممالک سے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں وہ لوگ مطالب الفرقان کو انگریزی میں منتقل کرنے کا تکرار کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے جو میرے جیسا عمر رسیدہ شخص اکیلا سرانجام نہیں دے سکتا۔ بہرحال میں نے ان کی تسلی کے لئے سورۃ فاتحہ کی تفسیر (GATEWAY TO THE QURAN) کے عنوان سے تیار کی ہے جو اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی تو عنقریب ۱۲۰ صفحات پر مشتمل کتاب کی شکل میں شائع ہو جائے گی۔ یہ نکات جو میں نے اوپر درج کیے ہیں یہ بھی اور ان کے علاوہ اور بھی اس کتاب کے دیباچے میں شامل ہیں۔ گو میں نے اس کتاب کو اور خاص کر ان مقامات کو جو کائنات کے متعلق ہیں اپنی طرز میں لکھا ہے لیکن اس کا (PATTERN) وہ ہے جو مطالب الفرقان کا ہے۔

عبدالودود

(ڈاکٹر سید عبدالودود۔ ۳۲ نسبت روڈ لاہور)

باب المراسلات

۱۔ صدقہ اور زکوٰۃ

باغبانپورہ لاہور سے محترم ایم بشیر صاحب اور کلرکہار سے جناب ایم عبدالکریم صاحب نے طلوعِ اسلام کے ایک سابقہ شمارے میں نظامِ زکوٰۃ کے بارے میں شائع ہونے والی تفصیلات پر اعتراض کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ میں فرق ہے۔ صدقہ مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ جب کہ زکوٰۃ حکومت دیتی ہے۔ ان کا فرمان ہے کہ زکوٰۃ کا نظام صدقات سے بہت بالا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مراسلہ نگار حضرات کا یہ خیال درست ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ میں فرق ہے۔ اور یہ کہ زکوٰۃ کا خرچ کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے جو مال خرچ ہوگا وہ مسلمانوں سے ہی اکٹھا کیا جائے گا۔ چنانچہ جہاں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ نظامِ زکوٰۃ کا ذکر ہے، وہاں یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار پاتا ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں بعض مقامات پر انفرادی طور پر بھی زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ البقرہ ۔ ۱۷۷۔ اور سورۃ النور ۳۷ اور سورۃ الروم ۔ ۳۹۔ مسلمانوں سے جب اس مقصد کے لئے مال لیا جائیگا تو اس کے لئے صدقہ کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مسلمان پاکیزہ مال کمائیں اور اسی پاکیزہ مال سے خود بھی خرچ کریں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے حکومت کے حوالے بھی کریں۔ صدقہ جس کا مادہ صدق ہے کے لغوی معنی ہر وہ عمل ہے جو انسان کے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھائے، اس کی تائید کرتے ہیں، بلکہ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ میں بھی ایسی ہی ہدایات ملتی ہیں۔ حکومت جو صدقات کی صورت میں وصول کرے، زکوٰۃ کی صورت میں مسلمانوں پر خرچ کریگی تو اسی کو نظامِ زکوٰۃ ہی تو کہیں گے۔ ہاں محترم بشیر احمد کا یہ فرمانا بجا ہے کہ زکوٰۃ کا مفہوم نظام صدقات سے بہت بالا ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ زکوٰۃ کے لفظ کو "نظام زکوٰۃ" کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اصطلاحی طور پر یہ اس نظام کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور اس سے بلند مقاصد کے لئے بھی، جیسا کہ صلوٰۃ کا لفظ مروجہ نماز کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اور نظامِ صلوٰۃ کے لئے بھی۔

امید ہے اس مختصر وضاحت سے ان کی کچھ تسلّی ہو جائے گی۔

۲- نابغۂ عصر

فیصل آباد سے محترم آصف رشید صاحب لکھتے ہیں :

طلوعِ اسلام کے ایک سابقہ شمارے میں رسول اللہ صلعم پر درود پڑھنے کی صحیح عبارت نظر سے گزری تو محسوس ہوا کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے جو درود نشر ہوتا ہے" اس کی عبارت غلط ہے۔ اسی دوران ٹیلی ویژن پر جناب طاہر القادری صاحب کا درسِ قرآن سنا، تو وہ بھی اسی غلط درود کو دہراتے رہے یعنی درود کے اصل الفاظ: صلی اللہ علیہ میں" و آلہ کا اضافہ کرتے رہے۔ جب علماء ہی غلط درود پڑھیں گے تو پھر ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کا کیا قصور ہے ؟

آپ نے لکھا تھا کہ اگر درود میں آلہ کا اضافہ کیا جائے تو عربی گرامر کے قواعد کے مطابق، اس سے پہلے حرف جار "علی" کا اعادہ ضروری ہے۔ کیونکہ علیہ کی ضمیر پر الہ کا عطف جائز نہیں، اس اصول کے مطابق درود کی عبارت یوں بنتی ہے۔

صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ وسلم

چنانچہ بندہ نے اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے جناب طاہر القادری صاحب کو خط لکھا کہ وہ درود کی صحیح عبارت پڑھا کریں تاکہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو والے بھی صحیح عبارت اختیار کر سکیں۔ انہوں نے ابھی تک درود کی غلط عبارت کو تو ٹھیک نہیں کیا، بلکہ میرے خط کا کوئی جواب دینے کی بجائے مجھے ایک پمفلٹ ارسال کر دیا ہے۔ جس کا عنوان ہے "نابغۂ عصر"، اس پمفلٹ میں دعوٰے کیا گیا ہے کہ جناب طاہر القادری صاحب اس دور کے سب سے بڑے عالم دین ہیں۔ غالباً مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ وہ اتنے بڑے عالم دین ہیں کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان میں عربی زبان کا اتنا ذوق بھی نہیں کہ انہیں درود کی غلط عبارت بار بار دہرانے سے اس کی غلطی کا احساس نہیں ہوتا۔

طلوع اسلام: آپ نے ایک اہم غلطی کی تصحیح کرانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہمارے علماء حضرات میں یہی تو سب سے بڑی کمی ہے کہ اگر ان کی کسی سنگین غلطی کی نشاندہی بھی کر دی جائے تو وہ اسے تسلیم کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اگر یہ غلطی جناب طاہر القادری صاحب تک محدود رہتی تو کوئی بات نہیں، یہ تو ان کے حوالے سے سارے ملک میں عام ہو رہی ہے۔ دراصل "آلہ" کا اضافے والا درود اہلِ تشیع کے ہاں مروج ہے، جن کا عقیدہ ہے کہ رسولؐ اور اس کی آل یعنی خاندان ایک ہستی ہے۔ لیکن اہلِ سنّت کے نزدیک ایسا عقیدہ ختمِ نبوّت کے تصوّر کے خلاف ہے اس لئے جناب طاہر القادری صاحب کو اس غلطی سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

حقائق و عبر

۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی منکرینِ حدیث کی صف میں!

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ہمارے ملک کے روشن خیال عالم دین ہیں۔ وہ جماعتِ اسلامی کے بانیوں میں سے ہیں اور اس کے امیر بھی رہ چکے ہیں، جب انہیں محسوس ہوا کہ جماعتِ اسلامی اپنے مِشن سے ہٹ رہی ہے تو انہوں نے اسے خیر باد کہہ دیا۔ اور اپنا علیحدہ ماہنامہ 'میثاق' جاری کیا۔ بعد میں ان کے ساتھ ہی جماعت کو خیر باد کہنے والے ڈاکٹر اسرار صاحب اس کے ایڈیٹر بن گئے۔ مولانا کو جب احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بھی پٹڑی سے اتر رہے ہیں تو انہوں نے اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اب اپنے آپ کو مولانا امین احسن اصلاحی سے بھی بڑا عالم دین سمجھنے لگے تھے بلکہ اپنے استاذ کی تحقیقات کو خلافِ اسلام قرار دینے لگے۔ چنانچہ وہ مولانا پر منکرِ حدیث کا فتوٰی لگا کر ان سے علیحدہ ہو گئے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب نے شہرت مولانا امین احسن کے نام پر حاصل کی تھی، اس لئے اکثر لوگ ان سے علیحدگی کا سبب پوچھتے ہیں۔ ماہنامہ میثاق کی ستمبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں انہوں نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:۔

مولانا امین احسن اصلاحی سے 'وصل و فصل' کی داستان کے آخر میں عرض کیا گیا تھا کہ "مولانا کے ساتھ تعلق کا جو تسمہ اب لگا رہ گیا ہے وہ صرف مصنف اور ناشر کے تعلق کی نوعیت کا ہے اور وہ بھی راقم اور مولانا کے مابین نہیں بلکہ انجمن خدام القرآن اور مولانا کے مابین ہے"۔

قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب یہ تعلق بھی ختم ہو چکا ہے۔ اور انجمن نے اپنی ادا کردہ رقم واپس لے کر مولانا کو ان کی جملہ تصانیف کے حقوقِ اشاعت واپس لوٹا دیئے ہیں۔

سبب اس کا یہ ہوا کہ تدبر قرآن کی جلد چہارم میں سُورۂ نور کی تفسیر کے ضمن میں مولانا نے حدِّ رجم کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اُس نے کم از کم اس مسئلے میں انہیں اہلِ سنّت کی صفوں سے نکال کر منکرینِ حدیث کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ جس وقت یہ جلد چھپی راقم نے ابھی اسے پڑھا نہیں تھا۔ بعد میں جب یہ بات راقم کے علم میں آئی تو سخت صدمہ ہوا کہ اس رائے کی اشاعت میں راقم الحروف اور اس کی قائم کردہ انجمن خدام القرآن بھی شریک ہے۔ تاہم جو تیر کمان سے نکل چکا تھا اس پر تو اب سوائے استغفار کے اور کچھ نہ کیا جا سکتا تھا۔ البتہ اس

جلد کی دوبارہ اشاعت پر طبیعت کسی طور سے آمادہ نہ ہوئی۔ ادھر یہ بھی کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ایک مصنف کی تصنیف کی اشاعت صرف اس لئے رُک جائے کہ وہ اس کے حقوق اشاعت کسی ادارے کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے۔

(۲) قومی اتحاد کی اندرونی کہانی!

ماہنامہ میثاق کے سب ایڈیٹر محترم سعید الرحمٰن علوی صاحب جو جمعیت علمائے اسلام کے کارکن کی حیثیت سے قومی اتحاد میں کام کرتے تھے وہ آج کل اپنے حالاتِ زندگی ماہنامہ میثاق میں قسط وار چھاپ رہے ہیں۔ ماہنامہ میثاق کی ستمبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں وہ قومی اتحاد کی اندرونی کہانی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :۔

> ۱۹۷۷ء کا سال ملک کے لئے جیسا کیسا تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ بھٹو صاحب اور ان کے بالمقابل قومی اتحاد، ہم بھی جمعیت کے خادم ورکر کی حیثیت سے قومی اتحاد کے پلیٹ فارم پر تھے اور بعض نازک مواقع پر اندرونی کہانیاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اتحادی قائدین کا معاملہ قرآن کے الفاظ میں "تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى" کا تھا۔ عوامی جذبات نے ان معاملات کو دبائے رکھا تھا لیکن افسوس کہ بعد میں اصغر خان اور نورانی میاں نے رستے خون سے بے وفائی کی تو بعض دوسرے حضرات نے "فوجی جنتا" کے قدموں میں "جمہوریت" کی قربانی دے کر اپنے مؤقف کی خود لٹیا ڈبو دی۔ اس موقعہ پر احقر نے شدید احتجاجی رویہ اختیار کیا لیکن ملک کے لئے بنیادی حقوق کے طالب اپنے ورکر کی زبان وقلم سے یہ احتجاج برداشت نہ کر سکے، جس کے بعد محسوس کیا گیا کہ پروگرام بے شک صحیح۔ دستور بہت اچھا اور مقاصد بہت بلند ہیں لیکن میرِ کارواں خوشامدیوں کے نرغے میں ہے۔ لہٰذا اب بادبدۂ پرنم چھٹی کرو۔

۳۔ دارالعلوم دیوبند کے بانی

دارالعلوم دیوبند کے بانیوں کے بارے میں ہمیں یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ان سے زیادہ نیک اور پارسا لوگ سارے برصغیر ہندو پاکستان میں موجود نہ تھے، لیکن دیوبند سے تعلق رکھنے والے ایک عالم دین مولانا سعید اکبر آبادی، جن کی ابھی حال ہی میں وفات ہوئی ہے، نے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں ایسے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ دیوبند سے اس کے بانیوں میں ایک عالم دین مولانا انور شاہ کشمیری کے استعفٰے کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیری کو دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل اس لئے جانا پڑا کہ اصل میں بات یہ تھی :

کہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے دارالعلوم کو اپنی ذاتی جائیداد سمجھ کر اسے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس میں اقربا پروری کا بہت دخل ہو گیا تھا۔ منتظم اعلیٰ حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے جو قاری محمد طیب مرحوم کے والد تھے اپنے ایک قریب ترین عزیز کو ناظم مطبخ بنانے کے بعد آپ نے ان کو سپلائی کا ٹھیکہ بھی دے دیا۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ بھئی یہ کیا تک ہے! وہ ناظم مطبخ بھی ہیں، ملازم بھی ہیں اور ٹھیکیدار بھی ہیں۔ یہ تو بڑی بے تکی بات ہوئی۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس (بات) کا بہت بُرا منایا گیا۔ اس پر شاہ صاحب نے اس روز عصر کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں پڑھی اور نماز کے بعد کہا کہ لوگو! ذرا ٹھہر جاؤ۔ لوگ رُک گئے تو شاہ صاحبؒ نے اس وقت یہ حدیث پڑھی: اَلْوَقْفُ لَایُمْلَکُ۔ یہ دارالعلوم جو ہے وقف ہے۔ کسی کی ذاتی جائیداد نہیں ہے کہ آپ جس طرح چاہیں، اسے استعمال کریں۔ آپ نے شوریٰ کو بیکار کر رکھا ہے اور مطبخ کا جو نیا انتظام کیا گیا ہے وہ میں برداشت نہیں کروں گا۔ بس بات بڑھی اور اسی (بات) پر استعفیٰ دینے کی نوبت آ گئی۔

۴۔ تبلیغی جماعت اور بدعات

ماہنامہ میثاق لاہور کی اگست ۸۵ء کی اشاعت میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ گفتگو کی تفصیلات شائع ہوئی ہیں۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے مولانا سے بہت سے دینی معاملات کے بارے میں سوالات کئے۔ جن کا انہوں نے جواب دیا ہے۔ مولانا صاحب اب مرحوم ہو چکے ہیں، اس لئے گفتگو میں انہیں مولانا مرحوم لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تبلیغی جماعت کے بارے میں ان سے جو سوالات کئے، اور مولانا نے ان کا جو جواب دیا، ان کا ایک حصّہ قارئین طلوعِ اسلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے:۔

ڈاکٹر صاحب:۔ مولانا! تبلیغی جماعت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

مولانا مرحوم:۔ تبلیغی جماعت! میں نے کہا نا کہ اچھا کام کر رہی ہے لیکن اس پر ہم پورا DEPEND نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ مجھے اس سے دلچسپی رہی نہیں رہی۔ اس لئے میں نے زیادہ سوچا نہیں۔ اس سے اگر فائدہ ہو رہا ہے تو اچھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب:۔ لیکن یہ کہ انہوں نے نہی عن المنکر کا راستہ بالکل بند کر رکھا ہے..... اس کو بالکل نظر انداز کر رکھا ہے۔ یہ تو دین کے لئے بہت مضر ہے۔

مولانا مرحوم:۔ یہی تو میں نے پہلے کہا تھا اور کل بھی۔ بہر حال اب وہ اسی پر قانع ہو بیٹھے ہیں۔ پھر اب ان میں تحزّب بھی بہت زیادہ ہو گیا ہے، بہت ہی زیادہ۔

ڈاکٹر صاحب:۔ آپ نے کل مولانا بنوری صاحبؒ کا واقعہ سنایا تھا۔

مولانا مرحوم: ۔ جی ہاں، جی ہاں ایک نہیں درجنوں واقعات ہیں ۔ یہ لوگ اپنے سوا کسی کو حق پر سمجھتے ہی نہیں ہیں ۔ ان میں تحزب و تخالف بہت بڑھ چکا ہے ... (مزید براں)

حضرت مولانا شاہ وصی احمد خاں الہ آبادی کے ایک مرید خاص ہیں ۔ بہت بڑے مولانا، بہت بڑے عالم اور بڑے گوشہ نشین اور بہت خاموش طبیعت ۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے تبلیغی جماعت کے اوپر ۔ اور بڑی سخت تنقید کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ تم بریلویوں کو کہتے ہو کہ بدعتی ہیں ۔ اور اس لئے کہتے ہو کہ جو چیز مباح ہے اس کو انہوں نے سنت، واجب اور فرض قرار دے دیا لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو یہ سب بدعات ہیں ۔ تم نے اہم دینی اصطلاحات کے معنی اور مفہوم ہی بدل کر رکھ دیئے ہیں ۔ انہوں نے بڑی سخت تنقید کی ہے ۔ میں نے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے پوچھا تھا کہ حضرت ہے (اس کا آپ کے پاس) کوئی جواب! بولے کوئی جواب نہیں ۔

۵ ۔ نفاذِ اسلام کی تین بنیادی تدابیر

دیوبندی مکتب فکر کا ترجمان ماہنامہ "البلاغ" کراچی اپنی ستمبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں نفاذِ اسلام کی تین بنیادی تدابیر پیش کرتا ہے ۔ جن کی تفصیل خود اس کے اپنے الفاظ میں کچھ یوں ہے :۔

یہ امر طے شدہ ہے کہ ریفرنڈم ۱۹۸۴ء اور الیکشن ۱۹۸۵ء کے پرامن و منصفانہ انعقاد کے نتیجے میں جو قیادت سامنے آئی ہے وہ صرف نفاذِ اسلام کے لئے حق نمائندگی رکھتی ہے ۔ اس نو منتخب قیادت کے سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق المعروف مردِ مومن مردِ حق ہیں جن کا جذبۂ نفاذِ اسلام عالمگیر شہرت کا حامل ہے ۔ ان کی خدمت عالیہ میں تین بنیادی تدابیر پیش کی جارہی ہیں جو اسلام کے احکام کے عین مطابق بھی ہیں اور تمام مسلم مکاتیبِ فکر کے درمیان غیر متنازعہ بھی ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

۱۔ قومی، صوبائی اور سینٹ کے ہر ممبر کو پنج وقتہ ادائیگی نماز کا آئینی اعتبار سے پابند کر دیا جائے ۔

۲۔ ناظرہ قرآنِ مجید پڑھنے کی شرط بھی ہر ممبر کے لئے لازمی قرار دی جائے ۔ ناخواندہ ممبران کو مناسب مدت میں اس شرط کو پورا کرنے کا موقع دیا جائے ۔

۳۔ متشرع شکل و صورت اختیار کرنے کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر دیا جائے ۔ عدمِ تعمیلِ حکم کی صورت میں متعلقہ ممبر کو نا اہل قرار دیتے ہوئے اس کی خالی نشست پر دوبارہ انتخاب کرایا جائے ۔

ان تدابیر میں اسلام کے مالیاتی نظام کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کے نفاذ سے ان حضرات کو زکوٰۃ کی رقم سے محروم ہونا پڑتا ہے ۔ جو وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق حکومت کے خزانے میں جمع کرانے کی بجائے خود وصول کر رہے ہیں اور اس طرح عملاً سرمایہ داری نظام کے مالیاتی نظام

کی تائید کر رہے ہیں۔

۶۔ کلمہ طیبّہ کے ورد سے روس اور بھارت کو شکست!

ہمارے اخبارات میں آج کل ایک دینی کالم کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں سائلین کے دینی سوالات کے جواب دیئے جاتے ہیں۔ ان سوالوں میں زیادہ تر امتحان پاس کرنے، کاروبار میں ترقی، خاوند کے دل میں محبت پیدا کرنے اور دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کے وظائف پوچھے جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو روزنامہ جنگ بابت ۴۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء) ان اخبارات کے مفتی حضرات ان لوگوں کو محنت کی تلقین کرنے کی بجائے، انہیں اس مقصد کے لئے وظائف کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پہلے صرف ان پڑھ لوگ توہمات کا شکار ہوتے تھے، لیکن اب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ توہمات کے ان چکروں میں پھنس چکے ہیں۔ اس کی ایک مثال ماہنامہ "طب و صحت" نے اپنی اگست ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں دی ہے:۔

کوئین میری کالج لاہور کی ایک لیکچرار صاحبہ کافی عرصہ سے حکومتی اداروں اور ملک کے دانشوروں اور علماء سے ملتجی ہیں کہ ان کی جان کو خطرہ سے نجات دلائی جائے۔ حال ہی میں ان کے خط کے ساتھ پولیس کو درخواست کی ایک کاپی موصول ہوئی ہے وہ لکھتی ہیں کہ "اگر آپ کا کوئی واقف ایسا ہے جو اس درخواست کے سلسلے میں سفارش یا بھاگ دوڑ کر سکتا ہے تو براہِ کرم اسے اطلاع کر دیں۔ غالباً یہ درخواست ہفتہ یا دس دن تک گلبرگ پولیس سٹیشن پہنچ جائے گی"۔

درخواست میں انہوں نے لکھا ہے کہ انہوں نے تعلیمی اداروں اور مسجدوں میں یہ تحریک شروع کی تھی کہ کلمہ طیبّہ کے ورد کو دفاعی تکنیک کے طور پر شروع کروایا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ اس متبرک کلمہ کی طفیل سے ملک کو روس اور بھارت جیسے بیرونی دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رکھے۔ اس تحریک سے ان کا مخالف ایک بے دین گروہ ان کے خلاف ہو گیا۔ اور اب لیکچرار صاحبہ کو ان سے جان کا خطرہ ہے، اس خطرہ کے تدارک کی انہوں نے درخواست کی ہے ہم ان کی درخواست پر مندرجہ ذیل مشورہ پیش کرتے ہیں:۔

محترمہ آپ کی داستانِ غم پڑھتے پڑھتے ہمیں آپ سے ہمدردگی ہو گئی ہے۔ آپ نے کلمہ طیبّہ کے ورد کو دفاعی تکنیک کے طور پر شروع کرانے کی تحریک چلائی تاکہ اللہ تعالیٰ اس متبرک کلمہ کی طفیل ملک کو روس اور بھارت جیسے ممالک کے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھے لیکن اس سے اسلام دشمن تو نہیں آپ کی جان کی دشمن ہو گئیں۔ اور ان سے بچاؤ کے لئے اب آپ حکام بالا اور پولیس سے مدد کی خواستگار ہیں۔

آپ کا طرزِ عمل تو یہ بات ثابت کرتا ہے کہ کلمہ طیبہ کے ورد کی دفاعی تکنیک روس اور بھارت جیسے بیرونی حملوں سے ملک کو محفوظ رکھنے میں کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جو تکنیک فردِ واحد کا دفاع کرنے میں ناکام ہے اس سے ملک کا دفاع ممکن نہیں۔

محترمہ سرزمینِ ملک کے دفاع کے لئے قرآن مجید کی تکنیک یہ ہے کہ مسلمان ہتھیاروں سے لیس رہیں اور جہاد یعنی جدوجہد بھی کریں۔ محض اللہ ہُو کے ورد سے دفاع کا نسخہ اسلام میں کہیں تجویز نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک جنگِ اُحد میں شہید نہ ہوتے۔

ورد کے ذریعے دفاع کی تکنیک بے عملی کا مظہر ہے وسائل میسّر ہوتے ہوئے آج مسلمان دنیا میں ذلیل و خوار ہیں تو اس کا سبب بے عملی اور اتحاد کا فقدان ہے۔

۷۔ جھوٹی قسمیں

مختلف رسائل میں سعودی عرب کے ایک واقعہ کی تفصیلات شائع ہوئی ہیں جس کے بارے میں معتبر عینی شاہدوں نے دعوے کیا ہے کہ وہ ایک سچا واقعہ ہے۔ اور اس واقعہ کا عنوان یہ قائم کیا گیا ہے:۔

"جھوٹی قسم کھانے سے انسانی شکل سانپ کی صورت میں تبدیل ہو گئی"۔

اس واقعہ کی تفصیلات کچھ یوں بیان کی گئی ہیں۔

جھنگ (ڈاک سے) سعودی عرب میں جھوٹی قسم کھانے پر انسانی شکل سانپ کی صورت میں تبدیل ہونے کا واقعہ سچا اور مبنی برحقیقت ہے۔ اس واقعہ کی تصدیق مؤتمر عالم اسلامی ضلع جھنگ کے نائب صدر مشیرِ اعلیٰ سیّد مفتی محمد یٰسین شاہ اور مؤتمر عالم اسلامی ضلع جھنگ کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل حکیم سیّد محمد ادریس بخاری نے گذشتہ روز فریضۂ حج سے جھنگ واپسی پر ایک استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کی۔ انہوں نے بتایا کہ امسال حج پر جانے والے اکثر حجاج نے اس واقعہ کی تصدیق کی جس کے بعد مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ کے مقامی باشندوں نے بھی اس امر کی تائید کی۔

اصل واقعہ کے مطابق سعودی عرب کے ایک عربی کے پاس کافی زمین تھی ایک بمبئی نے سعودی سے یہ معاہدہ کیا کہ اس زمین پر فلیٹ تعمیر کیا جائے۔ بمبئی نے تعمیر کے لئے تمام اخراجات کی ذمہ داری قبول کی۔ بالآخر ایک عالیشان عمارت کے بعد بمبئی جب اہلِ خانہ کو لے کر اس تعمیر شدہ جگہ پہنچا تو عربی نے صاف انکار کر دیا کہ بمبئی کا اس جگہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ اس تعمیر شدہ آدھی عمارت پر کوئی حق نہیں رکھتا۔ اختلاف بڑھ گیا۔ مسئلہ مقامی قاضی کی عدالت میں پہنچا۔ عربی نے صاف انکار کر دیا کہ بمبئی نے تعمیر پر کوئی رقم خرچ نہیں کی ہے۔ قاضی نے قسم اٹھانے کا حکم دیا۔ وقت مقررہ پر سب سے پہلے بمبئی نے قسم اٹھائی کہ زمین عربی کی ہے اور رقم میری ہے۔ اس کے بعد عربی نے قسم اٹھائی

کہ زمین اور تعمیر کا تمام خرچہ اس نے خود کیا ہے۔ یہ سنتے ہی یمنی پر دل کا دورہ پڑا کہ عربی کی اس قسم سے یمنی کی تمام رقم ضائع ہوگئی ہے اور وہ مرگیا۔ فیصلہ عربی کے حق میں ہوگیا۔ عربی جب واپس گھر پہنچا تو اس کی شکل آہستہ آہستہ بدلنا شروع ہوئی اور پاؤں سے گردن تک جسم سانپ کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ شکل تبدیل ہوتے ہی عربی نے چیخ و پکار کے علاوہ سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ سعودی حکام نے اس تعمیر شدہ عمارت کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور اس عربی کو جدہ منتقل کر دیا گیا ہے۔ اکثر حاجیوں نے اسے دیکھا ہے۔ وہ ایک کمرے میں کفن اوڑھے بیٹھا رہتا ہے وہ اپنی بربادی پر روتا رہتا ہے اور عذاب الٰہی سے پناہ مانگ رہا ہے۔ یہ واقعہ مسلمانوں کے لئے باعثِ عبرت ہے قسم کھانے اور کسی کے حق کو دبانے سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیئے۔

۸) مولانا محمد مالک کاندھلوی اور مارشل لاء:

آٹھ دس ماہ پہلے مارشل لاء کی تائید میں بیان دیتے ہوئے مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ سنتِ ابوبکرؓ ہے۔ لیکن ابھی ان کے اس بیان کی سیاہی ہی خشک نہ ہوئی تھی کہ انہوں نے آج مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو اپنے تازہ بیان میں اسے ملک میں تمام خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ان سے اس بارے میں یہ سوال کیا گیا:

سوال:- مولانا آپ نے مارشل لاء کے نفاذ پر اطمینان کا اظہار فرمایا تھا اور اس ضمن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نظامِ حکومت کی مثال بھی پیش کی تھی۔ اس کے بعد آپ مجلس شوریٰ میں شامل رہے اور مارشل لاء حکومت کی پالیسیوں سے بھی ہم آہنگی کا اظہار فرماتے رہے۔ آج جب کہ مارشل لاء کو نافذ ہوئے آٹھ سال کا طویل عرصہ بیت چکا ہے کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ مارشل لاء آپ کی یا عوامی توقعات پر پورا اترا ہے؟

جواب:- مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جن مقاصد کے لئے یعنی نظام اسلامی کے نفاذ کے لئے مارشل لاء لگایا گیا تھا وہ مقاصد حاصل نہیں ہوسکے۔ بلکہ اس کے برعکس بدعنوانیاں پہلے سے بہت بڑھ گئی ہیں۔ ملک میں افراتفری پھیل رہی ہے۔ امن عامہ کی صورتِ حال بہت بگڑ چکی ہے۔ مارشل لاء کی آمد پر محسوس کیا گیا کہ اب جرائم میں کمی ہو جائے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ عملاً صورتِ حال اس سے یکسر مختلف ہے اور جرائم پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں مارشل لاء نے اسلامی نظام نافذ کرنے کا دعویٰ کیا تھا جب کہ بظاہر ایسا کچھ ہوتا نظر نہیں آرہا۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

اب چونکہ ملک سے مارشل لاء کا خاتمہ کیا جارہا ہے۔ اس لئے مولانا صاحب اسی نظام کو جس کو انہوں نے سنت ابوبکرؓ قرار دیا تھا، قابلِ گردن زدنی قرار دے رہے ہیں۔

افکارِ پرویز کی صدی

(مسلسل)

اسلامی حکومت کا نظام

باب المراسلات کے عنوان میں صوبہ سرحد کے ایک مخلص دوست جن کا قلب، دردِ ملت سے ہر وقت تڑپتا رہتا ہے۔ رقمطراز ہیں...... جب طلوع اسلام سے دریافت کیا جاتا ہے کہ ہمیں ذرا اسلامی زندگی اور اسلامی قوانین اور اسلامی حکومت کا کچھ مختصر سا تصور تو پیش کر دیں تو وہ پہلو بدل کر کہہ دیتا ہے کہ یہ کام حکومت کا ہے۔ ہم اس روشنی کے لئے بیتاب ہیں لیکن اس کا اس نے گذشتہ ایک سال کے عرصہ میں کوئی حل پیش نہ کیا....."

طلوع اسلام نے اس شکوہ کو سر آنکھوں پر لیا ہے کہ اس نے آج تک اسلامی حکومت کے نظام (آئین) کو مرتب کر کے سامنے نہیں رکھا اور اس کی توجہ جب کبھی اس طرف منعطف کرائی ہے تو اس نے کہہ دیا ہے کہ یہ حکومت کا کام ہے۔

لیکن طلوع اسلام کیا کرے کہ اس کے نزدیک اس مطالبہ کا جواب ہی یہی ہے۔

آپ پوچھتے کہ اسلامی نظام میں ہو گیا کیا؟ ہم کہتے ہیں کہ اسلامی نظام میں پورا پورا عدل ہوگا ہر شخص کو اپنے جوہر ذاتی کے نشوونما اور ترقی و تکمیل کے لئے پورے پورے مواقع حاصل ہوں گے اور جس حد تک اس کی صلاحیتیں اسے لے جانا چاہیں گی، اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ لہٰذا ہر بچے کی تعلیم و تربیت (یعنی اس کی صلاحیتوں کے ابھار اور تکمیل) کی ذمہ داری حکومت کے سر ہو گی اور اس میں امیر و غریب کا کوئی لحاظ نہیں ہو گا۔

اسلامی نظام میں بسنے والے ہر فرد کی تمام ضروریاتِ زندگی کی کفالت حکومت کے ذمہ ہو گی۔ حکومت اس کی صلاحیتوں کے مطابق اسے کام دے گی اور اس کی اور اس کے متعلقین کی تمام ضروریات کی ذمہ داری خود لے لیگی۔ جو کام کے قابل نہ ہو گا اس کی بھی اور جو کام کر سکے گا اس کی بھی۔

اسلامی نظام میں کوئی شخص نہ دولت کے انبار جمع کر سکے گا نہ ہزاروں ایکڑ اراضی کے گرد سانپ بن کر بیٹھ سکے گا۔ کسی کی محنت کا ماحصل کوئی دوسرا نہیں لے جائے گا۔

اسلامی نظام میں ہر انسان کی بہ حیثیت انسان ہونے کے عزت ہوگی، نہ کہ حسب و نسب کی نسبتوں کی وجہ سے۔ اس کے بعد تکریم و تعظیم کے مدارج، بلندیٔ سیرت کے مطابق ہوں گے۔

اسلامی نظام میں نہ باہر سے کسی کا خوف ہوگا نہ دل کے اندر ہراس۔ اس میں شریف انسان کو کسی کا ڈر نہیں ہوگا اور بدمعاش کے لئے کہیں پناہ نہیں ہوگی۔

اسلامی نظام میں ڈاکٹر مریض کی صحت کے لئے جوابدہ ہوگا اور "حاکم" فریادی کی پکار کے لئے مسئول۔ اس لئے صحت اور انصاف گھروں کے اندر پہنچایا جائے گا اس کی تلاش میں سرگرداں نہیں پھرا جائے گا۔ غرضیکہ اسلامی نظام میں اوپر خدا ہوگا اور نیچے اس کے بندے اور ان دونوں کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوگی۔ یہ ہوں گے اسلامی نظام کے ثمرات و ماحصل ......

...... سو پہلی چیز تو یہ ہے کہ کسی نظام کا محض حروف و نقوش کی شکل میں سامنے لے آنا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ نظام اپنی عملی شکل ہی میں نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ طلوع اسلام جو اسلامی نظام مرتب کرے گا۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ آپ کی حکومت اسی نظام کو قبول کرے گی؟ لہٰذا اس کا مرتب کردہ نظام اپنی تسکین خاطر کے لئے ہی ہوگا۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کے پیش نظر طلوع اسلام نے باوصف ایں ہمہ اصرار و تکرار، اسلامی نظام کے جزئیات و فروعات مرتب کرنے سے احتراز برتا ہے۔ طلوع اسلام برسوں سے قرآن اور اس کے نظام کی دعوت دیتا چلا آرہا ہے۔ اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ اس نظام کو مرتب شدہ شکل میں بھی پیش کر دے لیکن اس کے نزدیک یہ کوشش بے سود اور یہ سعی لاحاصل ہے۔ اپنی حکومت کے ہوتے ہوئے اس قسم کی انفرادی کوشش بے معنی ہوتی ہے۔ حکومت سے کہیئے کہ وہ کہہ دے کہ اسے اسلامی نظام کی مرتب شدہ صورت مطلوب ہے۔ جسے وہ غور و فکر کے بعد، ملک میں نافذ کر دے گی۔ پھر دیکھئے طلوع اسلام کس طرح تعمق و یقین اور شرح و بسط سے اسے پیش کرتا ہے۔

افغانستان کی فتنہ انگیزی

رفتارِ عالم کے عنوان سے افغانستان کی فتنہ انگیزی پر تنقید کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے تحریر فرمایا کشمیر میں حالات کی پریشان کن رفتار کے ساتھ مارچ میں پاکستان کے مسلمان ہمسایہ، افغانستان نے کسی اشتعال کے بغیر پاکستان کے خلاف اعصابی

جنگ کا آغاز کیا۔ فقیر ایپی کے ساتھ جو تصادم ہوا تھا اس کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے ساتھ پاکستان کے خلاف متفرق قسم کے الزامات کابل ریڈیو اور سرکاری اخبارات کی وساطت سے نشر کئے گئے۔ ۲۲ مارچ کو حکومتِ پاکستان نے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے حکومتِ افغانستان کو لکھا کہ ڈیورنڈ لائن کے درے بسنے والے قبائل کے نیک و بد کا ذمہ دار پاکستان ہے نہ کہ افغانستان خود قبائلیوں نے پاکستان سے مکمل وفاداری کا اعلان کیا اور افغانستان کے خلاف غم و نفرت کا اظہار کیا۔

قیامِ پاکستان کے وقت بھی افغانستان نے پٹھانستان کی حمایت میں پاکستان کے داخلی معاملات میں دخل دینے کی کوشش کی تھی۔ افغانستان واحد ملک ہے جس نے ادارۂ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی رکنیت کی مخالفت کی تھی۔ بعد میں اسے اپنے رویہ پر بہت پشیمان ہونا پڑا۔ گذشتہ سال اس نے حکومتِ پاکستان کو مشورہ دیا کہ صوبہ سرحد کا نام بدل کر پٹھانستان رکھ دیا جائے۔ پاکستان نے قدرتی طور پر اسے مسترد کر دیا اس کے بعد کابل کا رویہ کچھ مصالحانہ ہو گیا تھا لیکن اس سال کے آغاز سے اس نے پھر معاندانہ رویہ اختیار کر لیا۔ افغانستان کے اس تمام پیچ و تاب کا سبب اس کا اپنا داخلی اضطراب ہے ۔۔۔۔۔۔ شاہی خاندان کے لئے عوامی اضطراب کی بے پناہیوں سے بچنے کی یہی ایک صورت ہے کہ افغانستان کو دوسرے (دوسروں کے) مسائل میں الجھائے رکھا جائے۔ اس کے علاوہ افغانستان کی اس اعصابی جنگ کے پیچھے "دستِ غیب" بھی کارفرما ہے۔ پچھلے دنوں ایک روسی جریدہ "نیو ٹائمز" نے یہ بے پر کی اڑائی تھی کہ برطانیہ پاکستان میں افغانستان کی سرحدوں کے ساتھ فوجی اڈے قائم کر رہا ہے اس سے مقصود دونوں ہمسایہ ممالک میں غلط فہمی پیدا کرانا تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق روسی کپڑا جو افغانستان میں درآمد کیا گیا ہے، قبائلی لوگوں میں بہت سستے داموں بیچا جا رہا ہے۔ ہندوستان اور افغانستان کے "تجارتی" تعلقات بھی استوار ہو رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔ افغانستان نے اپنے سفارتی عملہ کو پاکستان سے بلا لیا ہے اس موقع پر پاکستان کی بیرونی سفارتوں کی نااہلی کو بری طرح محسوس کیا جا رہا ہے۔ افغانستان سے سفارتی تعلقات کے انقطاع کی جو اطلاعات آتی رہی ہیں اگر وہ غلط ہیں تو ضرورت ہے کہ پاکستان اپنے سفراء کے تقرر میں سابقہ معیاروں کو ترک کر دے اور ان اہم مناصب کے لئے ایسے اشخاص کا انتخاب کرے جو ہر اعتبار سے ان کے اہل ہوں۔ اس کے علاوہ قبائلی علاقہ کے مسائل کی طرف بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے تاکہ ان کی مشکلات بدخواہانِ پاکستان کے عزائم کو تقویت نہ دے سکے۔

جولائی ۱۹۴۹ء

اس ماہ کے لمعات میں محترم پرویز صاحب نے دین و مذہب کے فرق کو واقعاتی انداز میں پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"دین نام تھا ایک اجتماعی نظامِ حیات کا، جس میں شامل ہونے والے ہر فرد کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس اہم مقصد کے حصول کے لیے وقف تھا جو اس نظامِ حیات کا منتہائے نگاہ تھا۔ یہ نصب العین تھا دنیا میں احکامِ خداوندی کی تنفیذ و ترویج۔ یعنی تمام غیر خداوندی نظام ہائے زندگی کی جگہ خالص نظامِ خداوندی کا تسلط۔ لِیُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ظاہر ہے کہ جس قدر یہ مقصد بلند اور اہم تھا اسی قدر اس کے حصول کے لئے تگ و تاز اور سعی و عمل کی ضرورت تھی۔

چنانچہ اس نظامِ زندگی کو اپنا نصب العین بنانے والے ہر فرد کی زندگی ایک مسلسل جہاد تھی اور چونکہ وہ مقصد بہت مقدس تھا اس لئے اس کے حصول کے لئے وقف ہو جانے والی زندگی کا ہر سانس مقدس تھا۔ نماز اور روزہ اور دیگر ارکان و اعمال دین اسی نظام کے اجزاء اور اسی حصولِ مقصد کے ذرائع تھے۔ لہٰذا ایک مردِ مومن کی ساری زندگی عبادت، یعنی عبودیتِ (محکومیتِ) خداوندی کی زندہ شہادت تھی وہ مصروفِ نماز تھا تو، اور مسجد کے باہر تھا تو، ہر وقت نمازی تھا کہ ساری زمین اس کے لئے مسجد تھی۔ وہ رمضان کے مہینہ میں روزہ دار تھا تو، اور باقی دنوں بغیر روزے کے تھا تو، وہ صائم الدہر (ہر وقت کا روزہ دار) تھا کہ جن حدود سے بچنے کا اسے حکم دیا گیا تھا وہ ان کے قریب بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ طوافِ کعبہ میں مصروف تھا تو، اور حریم کعبہ سے باہر تھا تو، ہمیشہ کا "حاجی" تھا کہ وہ مرکزِ حکومتِ خداوندی کی حفاظت کے لئے ہمیشہ سر بکف اور شمشیر بدست تھا۔ یہ تھی ایک مسلمان کی زندگی جو اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کی زندہ تفسیر تھی اس کی صلوٰۃ اور مناسک، اس کی حیات اور ممات، سب اللہ کے لئے وقف تھی کہ اس نے اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھوں بیچ رکھا تھا کہ وہ اس جہنم زار دنیا کو جنت میں تبدیل کر سکے۔ یہ تھا وہ دور جس میں دین کا نظام آنکھوں کے سامنے اور اس کا مقصود دل کے نزدیک تھا۔ اس نظام کا حصۂ اوّلا دنیا سے ملوکیت اور پیشوائیت (Priesthood) کا استیصال تھا تاکہ وہ انسانوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر ہر قسم کی غلامی سے نجات دلا سکے اور ہر بندے کو براہ راست خدا کے متعین فرمودہ نظامِ حیات کے تابع لے آئے جس کی سوتیں خود اس کے ضمیر کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہیں۔ اس نے ملوکیت کی لعنت کو خلافت کی برکت سے بدلا اور پیشوائیت کے حذام کی جگہ قرآنی معیار کو زندہ و پائندہ حقیقت کے طور پر نصب کر دیا۔ کہ ہر شخص براہ راست اپنے اعمالِ زندگی کو اس پر ناپے اور خود دیکھ لے کہ وہ کہاں تک اس پر پورے اترتے ہیں۔

یہ دور ختم ہوا تو شیطان، جو اس وقت تک پہاڑوں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا، دبے پاؤں پھر باہر نکلا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر جائزہ لیا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ دین کے وہ مظاہر جو محسوس پیکروں کی صورت میں اس قوم کے سامنے تھے۔

ان کا انہدام مشکل ہے کیونکہ اس سے اس قوم کے جذبات مشتعل ہو جانے کا ڈر تھا۔ چنانچہ اس نے تلبیسِ حق و باطل میں تخریبِ حق کا بہترین سامان پوشیدہ دیکھا۔ اس نے ان مظاہر کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا لیکن ان کا مقصود و مفہوم یکسر بدل دیا۔ خلافت کو اس نے ملوکیت سے بدل دیا لیکن سلطان کی جگہ نام خلیفہ ہی رہنے دیا۔ یہی وہ نام تھا جو باقاعدہ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں دہرایا جاتا تھا۔ ادھر اس نے نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مشہود پیکروں کو اپنی اپنی جگہ پہ قائم رکھا لیکن ان سے مقصود ایک انسان کی انفرادی نجات قرار پا گیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ زندہ حقیقتیں، جو کبھی یکسر شعلۂ بداماں اور انقلاب بآغوش تھیں، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئیں۔ خاکستر کے ان تودوں پہ تقدس و تبرک کے بڑے بڑے قبّے تعمیر کیے گئے جن کی مجاوری، پیشوائیت کے سپرد ہوئی۔ دین کا نظام، ملوکیت کے لئے پیامِ موت تھا اس لئے اس نے پوری کوشش کی کہ اس نظام کی حقیقت ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اس فریب میں رکھا جائے کہ اصلِ دین، یہی بے جان نمازیں اور بے روح روزے ہیں۔ یہ پیشوائیت کے تعاون کے بغیر ناممکن تھا اس لئے ملوکیت نے پیشوائیت سے مفاہمت کی اور جس طرح آریوں میں برہمن اور کھشتری کی ملی بھگت سے باقی انسانوں کو شودر بنا دیا گیا تھا اسی طرح ملوکیت اور پیشوائیت کی مفاہمت سے مسلمانوں جیسی غیور قوم کو ابدی غلام بنا دیا گیا۔ یہ ہے اس جگر سوز داستان کی تمہید جس سے دین، مذہب میں بدل گیا اور ارکانِ دین، رسومات بن کر رہ گئے۔ ہزار برس سے اس متاعِ سوختہ قوم کو اسی فریب میں مبتلا رکھا جا رہا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دنیا میں ہر "مذہب پرست" (دین کی حامل نہیں۔ بلکہ "مذہب پرست") قوم کی طرح، یہ ملت بھی روز بروز ذلیل سے ذلیل تر ہوتی چلی گئی۔ جب دین کا نظام سامنے تھا تو جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے: ایک مسلمان کی زندگی کا ایک ایک سانس مقدس و متبرک تھا۔ جب دین، مذہبی رسومات سے بدل گیا تو اب مختلف دنوں، مہینوں کو مقدس بنایا گیا۔ یہودیوں کے سبت اور عیسائیوں کے اتوار کے مطابق مقدس دن تصوّر کر لیا گیا۔ شبِ برات کی رات کو ہزار یمن و سعادت کی رات قرار دے لیا گیا۔ رمضان کا مہینہ سال بھر کے گناہوں کی معافی کا مہینہ سمجھ لیا گیا۔ اس ایک رات میں ایک ایک نفل کا ثواب، ہزار ہزار مہینے کی عبادت کے برابر قرار دے لیا گیا اور اس مہینہ میں شیطان کو جیل خانوں میں بند کر دیا گیا تاکہ وہ باقی گیارہ مہینوں میں پوری آزادی سے مصروف ابلیسیت و شیطنت رکھے۔ غرضیکہ وہی دین جس نے کبھی قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ کر ان کی جگہ ایک خدا کی حکومت قائم کر دی گئی تھی جس میں انسانیت اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں

بڑھ رہی تھی" اب "حصولِ ثواب" کا ذریعہ بن کر رہ گیا جس کا کوئی مفہوم نہ کہنے والے کے ذہن میں ہوتا ہے نہ سننے والے کے دل میں۔ یہ تھا وہ مذاق جو اس قوم نے خدا کے حیی وقیوم کے اس زندہ دین سے کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ یستھزی بھم و یمدّھم فی طغیانھم یعمھون۔ اللہ نے ان کی ایسی ہنسی اڑائی کہ انہیں ان کی بے راہ روی کی طغیانیوں میں بُری طرح حیران و سرگرداں چھوڑ دیا کہ یہ ہزار برس سے ٹکریں مار رہے ہیں لیکن کوئی کشادگی کی راہ ان کے سامنے نہیں کھلتی۔

سلیم کے نام آٹھواں خط

اس ماہ کے طلوعِ اسلام میں سلیم کے نام آٹھواں خط شائع ہوا ہے جس میں محترم پرویز صاحب نے کمیونزم اور اسلام کو بطور نظامہائے زندگی وضاحت کے ساتھ دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ اس خط میں کمیونزم کے متعلق عام تصور۔ ہیگل کا فلسفۂ اضداد۔ مادیت۔ مارکس کا فلسفہ جدید علم النفس۔ مارکسزم میں اخلاق کا تصور۔ اسلام کا فلسفۂ حیات۔ اسلام اور سرمایہ داری وغیرہ اہم موضوعات شامل ہیں۔

اگست ۱۹۴۹ء

اس ماہ کے طلوعِ اسلام کے صفحہ اوّل پر تحریر ہے۔

۱۵ر اگست کا پیغام

کوفہ کا عامل جب حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو اس نے دیکھا کہ اسلامی حکومت کا امیر جَو کی روٹی زیتون کے تیل کے ساتھ کھا رہا ہے۔ عامل نے کہا کہ آپ کے محروسہ علاقہ میں گیہوں کافی مقدار میں پیدا ہوتی ہے پھر آپ جَو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں؟

فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا کہ کیا گیہوں اتنی مقدار میں پیدا ہوتی ہے کہ ہر مسلمان تک اس کی روٹی پہنچ جائے۔

اس نے کہا اس کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟

آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا امیر اس وقت تک گیہوں کی روٹی کیسے کھا سکتا ہے جب تک ہر اس شخص تک جو اس کے علاقہ میں آباد ہے گیہوں کی روٹی نہ پہنچ جائے!"

اگر باین نرسیدی، تمام بولہبی است!

لمعات

اس ماہ کے لمعات میں عید الفطر اور ۱۵ر اگست کے جشنِ آزادی کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

زیرِ نظر پرچہ جب آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو آپ ایک جشن منانے سے فارغ ہو چکے ہوں گے اور دوسرا جشن منانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے ایک "دینی" جشن ایک "دنیاوی" جشن، ایک عید الفطر کا جشن۔ دوسرا ۱۵ر اگست کو جشنِ آزادی۔ طرب و نشاط کے مواقع اور جشن و مسرت کی تقاریب پر، آلام و مصائب کے تذکرے

اور دکھ درد کی داستانیں موزوں نہیں سمجھی جایا کرتیں۔ لیکن

دل کا خون آنکھوں میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو!

.....اگر آپ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں اور جھوٹی ہنسی کا نام شگفتگی قلب و بشاشتِ نگاہ رکھ لیتے ہیں تو اس سے حقیقت تو بدل نہیں جائے گی۔

آپ ابھی ابھی جشنِ عید سے فارغ ہوئے ہیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں اور آپ سینہ پر ہاتھ رکھ کر ہمیں بتائیے کہ کیا آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ بالآخر یہ عید ہے کیا اور اس تقریب کو کیوں منایا جاتا ہے۔ رمضان کیا ہے؟ اور روزے کس لئے رکھے جاتے ہیں؟ اگر آپ نے ان امور کو بھی درخورِ غور و تفکر نہیں سمجھا اور عید کی تقریب اس لئے مناتے ہیں کہ یہ اس طرح سے منتی چلی آ رہی ہے تو کیا آپ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اسے فی الواقعہ جشنِ مسرت سے تعبیر کریں۔

قوم کے ایک کثیر طبقہ کی (جس میں غریبوں کی اکثریت ہے) "مذہب سے" شیفتگی اور وابستگی کا اب تک یہ عالم ہے کہ گھر میں کھانے کو نہیں۔ سر چھپانے کا آسرا نہیں پیہم فاقوں سے بدن میں قوت مدافعت نہیں۔ جسم میں خون کا نشان تک نہیں۔ دن بھر چلچلاتی دھوپ میں مشقت کرتے ہیں تو بمشکل نانِ جویں نصیب ہوتی ہے۔ وہ بھی التزاماً نہیں۔ یہ حالات ہیں اور "مذہب" سے وابستگی کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان آتا ہے تو نہایت پابندی سے روزے رکھتے ہیں سحری کے لئے اٹھتے ہیں۔ تو بسا اوقات صرف پانی پی کر روزے کی نیت باندھ لیتے ہیں کہ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں اگر کچھ ملتا ہے تو وہ سوکھی روٹی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یوں روزہ رکھتے ہیں اور دن بھر دھوپ میں محنت کرتے ہیں۔ شام کو انہیں دیکھئے تو ضعف و اضمحلال سے ان پر مردنی چھائی ہوتی ہے۔ افطار کے لئے انہیں نمک سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ دن بھر کی کمائی سے بمشکل دال روٹی نصیب ہوتی ہے۔ رات کو گیارہ بارہ بجے تک نماز اور تراویح سے فارغ ہوتے ہیں۔ تین چار بجے پھر اٹھ بیٹھنا ہوتا ہے۔ اور دن بھر سونے کے لئے کوئی وقت نہیں ملتا۔ ان حالات میں اللہ کے یہ بندے روزے رکھتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جس قوم کا عزم ایسا راسخ ہو اور تکالیف برداشت کرنے کی ہمت ایسی کوہ شکن، وہ قوم دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکتی؟ لیکن مولوی ان کا خیال تک بھی اس طرف نہیں آنے دیتا۔ وہ انہیں سلائے رکھتا ہے کہ یہ تمام "اعمال" تمہارے "اعمالنامہ" میں لکھے جا رہے ہیں۔ قیامت میں ان سب کا "وزن" ہوگا۔ اور جس کا پلڑا بھاری ہوگا اسے جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ باقی رہی دنیا۔ سو دنیا مُردار ہے اور اس کا طالب کُتا۔

یہاں کوئی جس قدر ذلیل و خوار ہوگا۔ خدا کی نظروں میں اُسی قدر مقبول و محبوب قرار پائے گا۔ یہاں جتنا غریب اور مفلوک الحال ہوگا۔ وہاں اتنا ہی غنی اور مرفہ الحال ہوگا۔ یہاں کی دولت و ثروت کافروں اور "دنیا داروں" کا حصہ ہے جن کے لئے آخرت میں کچھ نہیں۔ وہ اس طرح امیروں اور سرمایہ داروں کا آلۂ کار بن کر، ان غریبوں اور محتاجوں کو افیون پلائے جاتا ہے اور وہی قوم جسے۔ ان ہی نمازوں اور روزوں کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر، ملوکیت، برہمنیت اور سرمایہ داری کے ہر ملعون نظام پر برقِ خاطف بن کر گرنا تھا، اس نظام کے استحکام و استبقاء کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ وہ انسانیت کش حربہ تھا جو ہمارے دورِ ملوکیت میں ایجاد ہوا اور اب ہزار برس سے متوارث و متواتر چلا آ رہا ہے۔ اور "اسلاف کے مسلک" کا لیبل اپنے اوپر لگا کر مقدس و متبرک بن چکا ہے کہ جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے گا اس کی آنکھ نکال دی جائے۔ کوئی خدا کا بندہ اتنا نہیں سوچتا کہ جن "اعمال" کو خدا نے آخرت سے پہلے، اسی دنیا کی بہترین متاع کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ جن کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ان کا لازمی اور حتمی نتیجہ دنیا کی بادشاہت بھی ہے۔ جن کے حاملین کے متعلق برملا کہہ دیا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت انہیں مغلوب نہیں کر سکے گی۔ جس نظام کے متعلق ساری دنیا میں اعلان کر دیا تھا کہ یہ نظام، تمام دیگر نظامہائے زندگی پر غالب رہے گا اور صرف بتا ہی نہیں دیا تھا بلکہ اس قوم نے جس نے سب سے پہلے ان "اعمال" کو ضابطۂ زندگی بنایا تھا، انہوں نے دکھا دیا تھا کہ کس طرح چند سالوں کے عرصہ میں، ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گھٹلیوں پر گزارہ کرنے والی صحرا نشیں قوم، قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کی مالک بن جاتی ہے ان "اعمال" کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ انہیں دنیا کی جاہ و ثروت، عزت و تکریم، دولت و حشمت، قوت و حکومت، سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ سب شان و شوکت جھوٹے نگینوں کی میناکاری ہے جو کافروں اور "دنیا داروں" کو جہنم کی طرف لے جانے کے لئے شیطان نے وضع کر رکھی ہے "اللہ والے"، وہی ہوں گے جو سب سے زیادہ خراب و خستہ حالت میں رہیں گے۔ یہ ہے وہ افیون جسے ملوکیت برہمنیت اور قارونیت[1] کی ملی بھگت نے وضع کیا اور جس سے قوم کے قوائے عملیہ کو اس درجہ مفلوج و مشلول کر دیا گیا کہ اب وہ اسی موت کو عینِ زندگی اور اسی خواب کو عینِ بیداری سمجھ رہے ہیں۔

(محمد اسلام صاحب) (جاری ہے)

---

[1] تذکرۂ صاحبِ ضربِ کلیمؑ میں دیکھئے۔ فرعون، ملوکیت کا علمبردار، ہامان، برہمنیت (Priesthood) کا نمائندہ اور قارون، سرمایہ داری کا مجسمہ ہے اور ان تمام بتوں کو توڑنے کیلئے عصائے موسوی۔